خزاں کے بعد

〈ناول〉

نوشابہ خاتون

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ساقی ارباب ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

گذشتہ چند برسوں میں جن
خواتین فکشن نویسوں نے اپنی تخلیقات
سے اُردو فکشن میں اہم مقام حاصل کیا
ہے، اُن میں ایک اہم نام نوشابہ خاتون کا
بھی ہے۔ اُردو فکشن میں کسی خاتون ناول
نگار کی آمد قابل ستائش و تحسین
ہے۔ نوشابہ خاتون کا پیش نظر ناول
''خزاں کے بعد'' ایک سوانحی انداز کا ناول
ہے۔ اِس ناول سے قبل اُن کے افسانوں
کے مجموعے ''نقار خانہ'' اور ''بالا دست''
اور ایک ناول ''نیا شوفر'' بھی منظر عام پر آ
چکے ہیں۔ نوشابہ خاتون کی تخلیقات گذشتہ
پندرہ برسوں سے مسلسل شائع ہو رہی ہیں
اور ادب کے قارئین ان تخلیقات سے حظ
حاصل کر رہے ہیں۔ ناول لکھنا ایک مشکل
اور دلجمعی کا کام ہے۔ اس کے لیے بڑے
کینوس، تحقیق اور تاریخی مطالعے کی
ضرورت ہوتی ہے۔ ناول نگار کا مطالعہ
وسیع اور فکر انگیز ہونا چاہیے۔ ناول نگار کا
اسلوب اس کی شناخت پیدا کرتا ہے۔
نوشابہ خاتون نے اس ناول میں معاشرتی
مسائل کو دلچسپ سوانحی انداز میں پیش کیا
ہے، جس میں دلکشی بھی ہے، رعنائی بھی
اور ادبی ہنرمندی بھی۔

میں نوشابہ خاتون کو اس ناول
کی پیشکش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے
امید ہے کہ یہ ناول علمی و ادبی حلقوں میں
پسند کیا جائے گا اور اُردو ناول کی تاریخ میں
یہ ایک خوشگوار اضافہ ثابت ہوگا۔

شہزاد انجم

پروفیسر، شعبۂ اُردو

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

گورنمنٹ
اردو لائبریری
پٹنہ ۴

خزاں کے بعد

(ناول)

حکومت بہار، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ (اردو ڈائرکٹوریٹ)
کے جزوی مالی تعاون سے شائع شدہ

خزاں کے بعد

(ناول)

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

نوشابہ خاتون

MAKTABA IN-E-KAAS
MUZAFFAR PUR (BIHAR)

©جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ

KHIZAN KE BAAD (NOVEL)

BY

NAUSHABA KHATOON
Cell: 9693347545

Year of Edition - 2017
Rs.250/-
ISBN No.

کتاب	:	خزاں کے بعد
مصنفہ	:	نوشابہ خاتون
سال اشاعت	:	۲۰۱۷ء
تعداد اشاعت	:	۵۰۰
قیمت	:	۲۵۰ روپے
طباعت	:	برائٹ آفسیٹ، پٹنہ
کمپوزنگ	:	ڈی ٹی پی کمپیوٹرس، کاظمی بیگم کمپاؤنڈ گذری، پٹنہ سیٹی-۸۰۰۰۰۸

:-ملنے کے پتے-:

- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴
- پرویز بک ہاؤس، سبزی باغ، پٹنہ-۴

Govt. Urdu Library
37592

چھوٹے ابّا

مرحوم سید حفیظ الرحمٰن

کے مقدس قدموں میں

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ اپنی داستانِ حیات کی ابتدا کہاں سے کرے۔

اس نے اپنی ماں کے سایۂ عاطفت میں اپنا وقت کس طرح گزارا تھا، اسے یاد نہیں۔

جب سے اس کی یادوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، وہ ایک منحوس شام تھی۔ اس کی ماں اسے چھوڑ کر اس جہان فانی سے رخصت ہوچکی تھی، پلنگ پر لاش پڑی تھی ایک سفید چادر سے ڈھکی ہوئی اور دادی اماں سینہ کوبی کررہی تھیں۔

کچھ دیر بعد اسے اور بھائی کو ابا کے ایک دوست کے یہاں پہنچادیا گیا۔ دونوں بھائی بہن نے رات وہیں گزاری۔ دوسرے دن جب وہاں سے واپس آئی تو گھر عجیب ویران اور سنسان بنا ہوا تھا۔

اپنی زندگی میں اتنے بڑے خلا کا اثر اس نے کچھ زیادہ نہیں لیا تھا کیونکہ اس وقت اس کی عمر صرف چھ سال تھی لہٰذا اسے یہ احساس نہیں تھا کہ اتنی اہم اور شفیق ہستی کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہے۔ شاید بھائی نے ان کی کمی کو شدت سے محسوس کیا کیونکہ انہوں نے اس سانحہ کا بہت زیادہ اثر لیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے متواتر آنسو گررہے تھے، آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ شاید وہ ساری رات روتے رہے تھے۔

''بھائی آپ اتنا کیوں رورہے ہیں؟'' اب تو چپ ہوجایئے۔''

''نوشین اماں کے بغیر اب ہم لوگ کیسے رہیں گے؟ کون ہمیں پیار کرے گا، کون کھلائے گا؟ بھائی نے روتے ہوئے کہا۔

''ابا ہیں نا، دادی اماں ہیں، چھوٹے ابا ہیں۔ یہ سب لوگ ہمیں کتنا پیار کرتے ہیں۔'' وہ اپنی دانست میں بھائی کا غم غلط کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

ooo

ابا جب آفس سے آتے تو دونوں بچوں کو پاس بیٹھا کر شفقت سے سر پر ہاتھ رکھتے اور سارے دن کی روداد پوچھتے۔

''آج کیا کھایا، کیا کیا کھیلا؟ گھبرائے تو نہیں؟ کسی نے ڈانٹا تو نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ ''ابا آج غفار کاکا نے بہت تیتی سبزی بنائی تھی''

''تب تمہیں کچھ میٹھا ملا؟'' ''نہیں'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''خیر کوئی بات نہیں تمہیں بالوشاہی اچھی لگتی ہے نا؟''

بھائی تو خاموش رہے لیکن اس نے بڑے زوروں سے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے آج میں تمہارے لئے بہت ساری بالو شاہی منگوادوں گا۔'' ابا نے پیار کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد دادی اماں بھی وہاں پر پہنچ گئیں۔ اور ان کی گفتگو کا کچھ حصہ سن کر کہا۔

''اسی لئے تو کہتی ہوں کہ پھر سے گھر بسالو، ان معصوموں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں بوڑھی جان کب تک انہیں سنبھالوں گی۔ بیٹا! مرنے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے ان کا سوگ کب تک مناتے رہوگے اور ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ تم خود کم عمر ہو۔ تمہیں خود کسی کی رفاقت کی ضرورت ہے

جس سے اپنا دکھ سکھ بانٹ کر اپنا غم غلط کرسکو۔ اور چاہے جوان ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت، ہر انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر ایک ساتھی کی ضرورت پیش آتی ہے جس سے وہ اپنا دکھ درد بانٹ سکے۔ تم میری بات غور سے سنو اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔'' وہ دیر تک انہیں سمجھاتی رہیں اور ابا بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ دادی اماں کے جانے کے بعد اس نے پوچھا۔

''بھائی! دادی اماں یہ سب کیا کہہ رہی تھیں۔ گھر بسانا کیا ہوتا ہے؟''

''چپ کر پڑھنا لکھنا تو یاد رہتا نہیں، یہ سب باتیں خوب یاد رہتی ہیں۔'' بھائی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''کیوں ڈانٹتے ہو بھائی۔ مجھے بہت ڈر لگ لگتا ہے۔ اماں بہت یاد آتی ہیں۔ رات میں جب میں سوتی ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ مجھے پیار کررہی ہیں لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو وہاں کوئی نہیں ہوتا۔ ڈر سے میں دادی اماں سے لپٹ جاتی ہوں۔''

''بے وقوف! اس میں ڈرنے والی کون سی بات ہے، اماں کوئی بھوت تھوڑے ہی ہیں۔'' بھائی نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے جب ابا آفس اور تم کھیلنے چلے جاتے ہو کل سے مجھے بھی ساتھ لے جانا۔''

''میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا کیونکہ وہاں پر ایک بہت بڑا پوکھرا ہے، خدانخواستہ اگر تم گرگئیں تو؟'' جب گرنے لگوں گی تو تمہیں پکڑ لوں گی۔'''لو اور سہی خود تو گرے گی ہی ساتھ میں مجھے بھی لئے ڈوبے گی۔'''جب تم تنہا ہوتی ہو تو اپنے کھلونے سے کیوں نہیں کھیلتی''سلیم مجھے تنگ کرتا ہے کھلونے چھپادیتا ہے۔ بھائی اماں کیوں مرگئیں؟ اس کی آنکھیں

آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ بھائی نے اسے بے ساختہ لپٹالیا۔ اسے بھی اماں کی یاد شدت سے آنے لگی جسے بڑی مشکل سے اس نے بھلانے کی کوشش کی تھی۔

''چپ رہ گڑیا اب میں تجھے کبھی اکیلی نہیں چھوڑوں گا۔''

ooo

اس نے اب اماں کے بغیر جینا سیکھ لیا تھا۔ یوں تو قدم قدم پر ان کی یاد آتی تھی۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک اثر نہیں لیتی۔ فوراً کھیل کود میں مگن ہو جاتی۔ دن مزے سے گزر رہے تھے کہ اچانک ماحول میں کچھ تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ سامنے سڑک پر صبح شام ایک بڑا جلوس ہندوستان چھوڑ وکا نعرہ لگاتے ہوئے گزرتا۔ ہر طرف جلسے جلوس ہونے لگے تھے۔ اندولن کا زور بڑھ گیا تھا۔ اسٹیشن سامنے تھا وہاں سے بھی نعرہ بازی اور توڑ پھوڑ کی آوازیں آتی رہتیں۔ ایک دن ایک ہجوم ابا کے آفس کے کمپاؤنڈ میں گھس آیا اور آفس کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اس وقت انقلابیوں کا دل غم و غصہ سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ان کی ایجاد کی ہوئی ہر چیز، ہر نشان کو مٹا دینا چاہتے تھے یہاں تک کہ جو عہدہ دار اپنے محکمہ کی سب سے اونچی کرسی پر براجمان ہو۔ انہیں بھی نقصان پہچانے سے نہ چوکتے۔

موقع کی نزاکتوں کو دیکھتے ہوئے ابا کے ماتحتوں نے انہیں چھپادیا۔ انقلابی انہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے۔ جب وہ ہاتھ نہ آئے تو آفس کو پٹرول چھینٹ کر آگ لگادی۔

کوائٹر کمپاؤنڈ کے اندر ہی تھا۔ لیکن خدا کا شکر تھا کہ ادھر ان لوگوں نے رخ نہیں کیا۔ شاید یہ دادی اماں کی دعاؤں کا اثر تھا ورنہ ان لوگوں کی بھی

خیر نہ تھی۔

دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ آفس کا کئی حصہ جل کر خاک ہو چکا تھا اور خاص کر ابا کا اجلاس۔

اس رات تو ابا کو پہرے میں رکھا گیا پھر کچھ دنوں کے لئے وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

اس صورت حال سے ابا گھبرا گئے۔۔ بچوں کی تنہائی انہیں بری طرح پریشان کر رہی تھی۔ کچھ دادی اماں کی نصیحت کا اثر تھا کہ وہ شادی کے لئے رضامند ہو گئے۔

ooo

ایک دن ابا دونوں بچوں کو آزو بازو لپٹائے زارو قطار رو رہے تھے۔

دوسرے دن نئی امی گھر آ گئیں۔ وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ گوری گوری نازک سی امی اسے بہت اچھی لگیں۔ وہ ہر وقت ان کے ارد گرد منڈلاتی رہتی ان کے پاس سے ہٹنے کے لئے اس کا دل نہیں چاہتا لیکن جب وہ بہت زیادہ اچھل کود کرنے لگتی تو وہ اندر سے دروازہ بند کر لیتیں۔ وہ اداس ہو جاتی۔ پھر سوچتی، ویسے امی ہیں بہت اچھی، نہ اسے ڈانٹتی ہیں نہ مارتی ہیں لیکن اسے پیار بھی تو نہیں کرتیں۔ اماں کی طرح اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا بھی نہیں کھلاتیں نہ اسے نہلاتی اور کپڑے بدلتی ہیں پھر بھی وہ اسے بہت اچھی لگتی ہیں۔

ایک دن وہ ان کے کمرے میں آنکھیں بند کر کے سوتی بن گئی تب ہی ابا کی آواز سنائی دی۔

"سوتے ہوئے میری بیٹی کتنی معصوم لگ رہی ہے۔ پھر امی کی آواز

آئی۔ ''اسے یہیں سونے دیجئے۔''

''نہیں، اٹھ جائے گی تو روئے گی اماں کو تلاش کرے گی۔'' ابا نے اسے جبراً دادی اماں کے پاس بھیج دیا۔

اسی طرح کی کئی ہلکی ہلکی یادیں اس کے ذہن کے پردے پر ابھرتیں۔ لیکن کوئی واضح تصویر سامنے نہیں آتی، کیونکہ اس وقت تک وہ شعور کی اس منزل تک پہنچی ہی نہیں تھی۔ پھر دھیرے دھیرے اسے اپنی زندگی میں ایک بڑے خلا کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ گھر میں آنے والی اس تبدیلی میں وہ ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی تھی۔ تب اس نے کھیل کود اور شرارتوں کا سہارا لیا لیکن جب ابا اسے شرارتیں کرتے ہوئے دیکھ لیتے تو دو چار تھپڑ رسید کر دیتے کیونکہ انہیں لڑکیوں کا اس طرح اچھل کود کرنا پسند نہیں تھا۔ ان کے خیال میں لڑکیاں سنجیدہ ہی اچھی لگتی ہیں۔ لڑکے بھلے چاہے جتنا بھی اچھل کود کرتے رہیں۔

لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا، بھائی جتنے سیدھے اور سنجیدہ تھے وہ اتنی ہی چنچل اور کھلنڈری تھی۔

ویسے ابا دونوں بچوں کو یکساں چاہتے تھے۔ کوئی پارٹی ہو یا فنکشن دونوں کو اپنے ساتھ ضرور لے جاتے تھے۔

اس کے بچپن کا ایک پر لطف قصہ ہے وہ بہت چھوٹی تھی شاید اس وقت اماں حیات تھیں کیونکہ ایک خاکہ سا ذہن میں ابھرتا اور ڈوبتا ہے۔

کسی مارواڑی کے یہاں کوئی تقریب تھی۔ پورا گھر اور کمپاؤنڈ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ جگہ جگہ ٹیبل اور کرسیاں لگی تھیں، مشروبات سرو کیے جا رہے تھے۔ خوبصورت اور خوش لباس لڑکیاں ادھر سے اُدھر گھوم رہی تھیں۔ وہ اسے اندر لے گئیں۔ وہاں اس کے لئے مٹی کے برتن میں مٹھائی آئی۔ لیکن اس نے

مٹھائی کو ہاتھ نہ لگایا۔ بھائی اسے بار بار ٹھوکا دے رہے تھے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ لوگوں کے اصرار پر اس نے منہ پھلا کر کہا۔ ''میں تو چینی کی پلیٹ میں کھاتی ہوں۔'' لڑکیوں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر اس کی فرمائش پوری کی گئی۔ شاید یہ واقعہ اس کے ذہن سے محو ہو جاتا لیکن بھائی اسے اکثر چھیڑتے۔

''بھئی یہ تو بڑی آدمی ہیں۔ چینی کے پلیٹ میں کھاتی ہیں اور شیشے کے گلاس میں پیتی ہیں۔''

اب جب بھی وہ اس واقعہ کو یاد کرتی ہے تو اسے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ بچپن ہی سے نفاست پسند ہے یا شاید گھر کے ماحول یا تربیت کی اس پر چھاپ ہے۔ ابا بھی بہت ہی نفاست پسند تھے۔ گھر کا ماحول بہت ہی صاف ستھرا تھا ہر کام ترتیب اور اصول سے انجام پاتا تھا۔ کبھی تام چین اور المونیم کا برتن پلیٹ اور پیالہ کے طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ گھر میں کئی ملازم بھی تھے۔

اس نے آنکھ کھولی تو ایسے ہی ماحول میں خود کو پایا جو اب ایک خواب کی طرح اس کے ذہن میں محفوظ ہے۔

ooo

دیر سے گھر گھر کر بادل آرہے تھے۔ پھر دھواں دھار بارش شروع ہوگئی۔ وہ دور کھڑی للچائی نظروں سے دیکھ رہی تھی اس بارش میں نہانے کے لئے اس کا دل مچل رہا تھا۔ لیکن اسے نہانے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس کے مزاج کے بالکل خلاف تھی۔ وہ اپنے معاملہ میں زیادہ روک ٹوک برداشت نہیں کرسکتی تھی لیکن ابھی بچی تھی زیادہ احتجاج نہیں کرسکتی تھی۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ لیکن جب بارش تھمی تو آنگن میں جمع شدہ پانی میں چھپ

چھپ کر کے دوڑنے لگی۔

اچانک پاؤں پھسلا اور وہ ایسی گری کہ چوڑی ٹوٹ کر کلائی میں چبھ گئی۔ زخم اتنا گہرا تھا کہ بہت دنوں تک بھر نہ سکا۔ بھرنے کے بعد بھی زخم کا نشان گہرا تھا اس حماقت پر وہ بہت دنوں تک اپنے بزرگوں سے لعن طعن اور ڈانٹ سنتی رہی۔

کبھی کبھی اُسے اپنا ننھیال شدت سے یاد آنے لگتا اور شاید اس کے دل کی آواز ہی تھی کہ نانی اماں کے دل میں نواسے نواسی کی محبت نے جوش مارا اور وہاں سے ان کے لئے بلاوا آ گیا۔ ابا نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا خوشی خوشی اجازت دے دی۔ اب تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ امی نے نیا فراک سی کر دیا تھا جسے پہن کر وہ پھولے نہ سما رہی تھی۔ کبھی خود کو آگے سے دیکھتی اور کبھی پیچھے سے۔ پورے سفر میں وہ خوشی کے ہنڈولے پر جھولتی رہی۔

جب وہ اپنے ننھیال پہنچی تو نانی اماں، خالہ اماں اسے گلے لگاتے نہیں تھک رہی تھیں۔ سارے کزن اُسے ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے۔ اتنی محبت پا کر وہ اپنی ساری اداسی بھول گئی جو کچھ دنوں سے اس پر طاری تھی۔

سارا دن وہ کھیل کود میں مگن رہتی خاص کر انی بھائی سے اس کی خوب بنتی تھی۔ ان کے ساتھ وہ کبھی کھیت پر جاتی اور کبھی تالاب پر۔ تالاب کے کنارے کھڑی ہو کر مچھلیوں کو لاوا دیتی، جب مچھلیاں اوپر آجاتیں، پانی کی سطح پر چھا جاتیں تو اُسے بڑا مزہ آتا۔

تالی بجا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتی۔ کبھی کھیت سے جھنگڑی توڑتی تو دور سے رحمت نانا آواز دیتے۔ ''بیٹا! ابھی پودا میں دانہ نہیں آیا ہے، اسے نہ توڑیئے۔''

پھر قریب آکر کہتے۔ ''یہ سب ان انی بابو کی شرارت ہے۔ رُکیئے بڑی بی بی سے شکایت کرتا ہوں۔'' اور وہ دونوں گرتے پڑتے تیزی سے بھاگتے۔

کبھی بڑی اور چھوٹی آپا اس سے کہتیں۔ ''نوشین ذرا ایک گیت تو سناؤ۔''، ''نہیں آپ ہنسیں گی'' وہ شرما کر کہتی۔

''نہیں ہنسوں گی۔ تم اتنی اچھی اتنی پیاری بچی ہو بھلا تم پر کون ہنس سکتا ہے۔'' وہ اسے پیار سے لپٹا لیتیں تب وہ پلنگ پر بیٹھ کر پاؤں ہلا ہلا کر بڑے ہی سرتال سے گیت گانا شروع کردیتی، جو اس نے حال ہی میں نئی خالہ کی شادی میں سیکھا تھا۔

اس کی اس ادا پر سب ہنستے اور شاباشی بھی دیتے پھر کیا تھا وہ جوش میں آجاتی، صرف گیت ہی نہیں انہیں ساری روداد سنا ڈالتی جو اس نے اس موقع پر دیکھا تھا۔ نئی خالہ کے سسرال بھی گئی تھی وہاں اس نے پستے کی قبولی کھائی تھی جس کا ذائقہ اسے اب تک یاد تھا۔ نانی اماں بھی پاس ہی بیٹھی اس کی باتیں سن کر مسکرا کر رہی تھیں اور محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

نانی اماں کی شخصیت بہت ہی قابل قدر تھی۔ وہ ایک نیک اور سیدھی سادی خاتون تھیں۔ اپنے پرائے سب کے لئے ان کے دل میں درد تھا۔ اور اپنے بچوں کے لئے تو ان کے دل میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ کیا مجال جو وہ بچوں کے بغیر اکیلی کچھ کھا پی لیں۔ یہاں تک کہ چائے بھی اکیلی نہیں پیتیں۔ صبح شام ایک دیگچی چائے بنتی جس میں دودھ کی مقدار زیادہ ہوتی۔ الائچی والی چائے خوشبو دار بھاپ اڑاتی ہوئی، چھوٹے چھوٹے پیالوں میں بچوں کے بیچ تقسیم کی جاتی اور نانی اماں انہیں شفقت بھری نظروں سے دیکھتی رہتیں۔

اسی دوران محرم کا مہینہ شروع ہوگیا۔ سب بچوں کے لئے سبز کپڑا،

بندھنیا اور بٹوا بنا۔انی بھائی، ہمیشہ اسے چھیڑتے اور چڑھاتے رہتے تھے۔

''نوشین دیکھو میرا بٹوا بڑا ہے اور تمہارا چھوٹا۔ بندھنیا مجھے زیادہ ملا ہے۔ نانی اماں مجھے زیادہ چاہتی ہیں۔''

''جی نہیں ! نانی اماں مجھے زیادہ چاہتی ہیں۔ اس نے منہ پھلا کر کہا۔ وہ تو میں چھوٹی ہوں اس لیے میرا بٹوا چھوٹا ہے۔ تمہیں یاد نہیں جب ماموں جان نے ٹافی بھیجی تھی تو نانی اماں مٹھی بھر بھر ٹافی مجھے دے رہی تھیں۔ اور تم دور کھڑے للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر نانی اماں نے دو ٹافی تمہارے ہاتھوں میں پکڑاتے ہوئے کہا۔'' لے ! جا بھاگ ندیدہ کہیں کا۔''اور تم میرا منہ چڑھاتے ہوئے بھاگ گئے۔ شاید تم اسی لئے مجھ سے جیلس رہتے ہو کیونکہ نانی اماں کی محبت میں تمہیں کسی کی شراکت برداشت نہیں۔''

اب محرم کی گہما گہمی شروع ہوچکی تھی۔ خوب میلہ لگا تھا، امام باڑہ گھر سے نزدیک ہی تھا۔ ہم سب بچے سبز سبز کپڑا پہن کر سپر تعزیہ دیکھنے جاتے اور گڑ کا کھاجا جلیبی خرید کر کھاتے۔ محرم کی دس تاریخ کو اکھاڑا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتا۔ جواں سال لڑکے خوب تلوار لاٹھی بھانجتے۔ بچے سب کیا کے کندھوں پر بیٹھ کر ساری رات تماشہ دیکھتے۔

وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ براہل اور کیا کتنے وفادار اور قابل بھروسہ تھے کیا مجال جو مالک کے بچوں کو ذرا بھی کوئی تکلیف پہنچے۔ ان کا بال بیکا نہ ہو۔ بخیر و خوبی انہیں گھر تک پہنچاتے اور مالک سے انعام واکرام پاتے۔

ایک ماہ اس نے خوب تفریح کی خوب لطف اٹھایا پھر دل پر جدائی کا بوجھ لیے وہاں سے روانہ ہوگئی۔

ooo

واپسی میں پورے سفر وہ اداس رہی۔ کبھی خوشگوار لمحوں کو یاد کرتی تو ہونٹوں پر ہنسی آجاتی اور جب ان لوگوں کی یادیں ستاتی تو آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

وہاں آنے کے بعد وہ ہفتوں اداس رہی۔ کبھی نانی اماں کی شفقتیں یاد آتیں، کبھی خالہ اماں کی پیار بھری باتیں، کبھی بڑی آپا کے دو چار نصیحت آمیز جملے تو کبھی چھوٹی آپا کی پر مذاق باتیں اور سب سے زیادہ انی بھائی کی شرارتیں۔

اب پھر وہی روٹین تھی، وہی شب و روز۔ بھائی تو ہر وقت پڑھائی لکھائی میں لگے رہتے کیونکہ اس کے علاوہ اور ان کا کوئی مشغلہ تھا ہی نہیں۔ وہ بھی کچھ نہ کچھ پڑھنے کی کوشش کرتی لیکن پڑھائی لکھائی میں زیادہ اس کا دل نہیں لگتا۔

گھر میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ تو اس کے ساتھ کوئی کھیلنے والا تھا نہ کوئی بات کرنے والا تھا۔ گرمی کی پوری دوپہر وہ بند کمرے کی کھڑکی پر چڑھی بیٹھی رہتی، سامنے ریلوے اسٹیشن تھا، ہر تھوڑی دیر پر گاڑی گزرتی۔ انجن کی دلخراش آوازوں میں اسے زندگی جاوداں نظر آتی۔

ابا کا حکم نہیں تھا کہ بچے کمپاؤنڈ کے گیٹ سے باہر جائیں لیکن اسے جیسے انتظار رہتا ابا آفس گئے اُدھر وہ گیٹ سے باہر۔ دو قدم پر اسٹیشن ماسٹر کا ٹوٹر تھا ان کی لڑکی سے اس نے دوستی گانٹھ لی تھی۔ لیکن وہ لڑکی بہت لالچی اور چالاک تھی اسے بہلا پھسلا کر اس کے وہ سارے کھلونے گڑیا اور گڑیا کی شادی کے سارے لوازمات ہڑپ کر گئی جو نئی امی نے بڑے پیار سے اُسے دیا تھا۔ یہ سب کھلونے شاید ان کے بچپن کی نشانی تھی جس کے ضائع ہونے کا اسے بہت

افسوس ہوا۔ لیکن چلو ان چیزوں کے بدلے اسے ایک ساتھی تو مل گئی تھی جس کے ساتھ وہ سارا دن کھیلتی۔ اس کے کمپاؤنڈ میں ایک بڑا سا برگد کا پیڑ تھا جس میں لوہے کی زنجیر کا جھولا پڑا تھا۔ دونوں ساتھ مل کر خوب جھولا جھولتیں۔ اور وہ کبھی جو پکڑی جاتی تو ابا کے عتاب کا شکار ہوجاتی دو چار جھاپڑ کھاتی، کھلونے توڑ کر پھینک دیے جاتے گڑیا چولھے میں جھونک دی جاتی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں رودھوکر وہ اپنی ڈگر پر آجاتی۔

ooo

وہ اکثر ہی اپنی دادی اماں کے پاس گاؤں جاتی رہتی تھی۔ کیونکہ پڑھنے لکھنے کا منظّم سلسلہ کوئی خاص نہ تھا۔ گرچہ تعلیم نسواں کا دور شروع ہو چکا تھا لیکن ابھی اس کا خاندان اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا کہ لڑکیوں کو اسکول اور کالج بھیجنے کی جسارت کی جاتی۔ لہٰذا جب تک جی چاہتا وہ وہاں رہتی کیونکہ وقت کی نہ کوئی قید تھی، نہ کوئی قیمت، نہ اہمیت۔ وہاں پہنچتے ہی وہ کھیل کود میں مگن ہوجاتی نغمی اس کی بہت ہی قریبی دوست تھی اور اس سے مقابلہ اور نوک جھونک بھی ہمیشہ چلتی رہتی ایک دن اس نے اپنا کھلونا دیکھاتے ہوئے کہا۔ ''نوشین دیکھو! میرے پاس کتنے سارے کھلونے ہیں تمہارے پاس تو ایک بھی نہیں۔''

''ہے کیوں نہیں، میں یہاں تھوڑے ہی لے کر آتی ہوں''۔ نوشین نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اگلی بار آنا تو کھلونے لے کر ضرور آنا۔''

''کیوں لاؤں؟''

''ذرا دیکھوں تمہارے پاس کون کون سے کھلونے ہیں۔'' ''اور اگر نہ ہوئے تو کیا تم مجھے اپنے کھلونے دے دوگی؟'' وہ بھی کب اس سے دبنے والی

تھی۔نغمی منہ لٹکائے ہوئے چلی گئی اور وہ منہ ہی منہ بدبدانے لگی۔''ہنہ بڑی آئی مجھے کھلونے کا دھونس دینے والی۔'' کبھی وہ کھیل میں زیادہ غرق ہوتی تو دادی اماں کے غصہ کی زد میں آجاتی۔

''یہ کیسی ہڑدنگ مچارکھی ہے، نہ کھانے کا ہوش نہ نہانے دھونے کی فکر، نہ پڑھائی لکھائی سے واسطہ، نہ کوئی طور طریقہ۔ آنے دے تیرے باپ کو، پوچھتی ہوں کہ بیٹی کو یہی تربیت دی ہے۔''

ان کی ڈانٹ سن کر اُسے بڑا غصہ آتا۔ سوچتی اب یہاں نہیں رہوں گی، واپس چلی جاؤں گی۔لیکن کچھ ہی دیر میں سب کچھ بھول جاتی، اور رات ہوتے ہی دادی اماں کے لحاف میں گھس کر، ان کی محبت کی گرمی پاکر نیند کی آغوش میں پہنچ جاتی۔

ooo

ابھی جہاں ابا کی پوسٹنگ تھی وہ کوئی بڑی جگہ نہ تھی بلکہ ایک چھوٹا سا سب ڈیویزن تھا، جہاں گنے چنے چند افسرز تھے جو اپنے محکمے کی سب سے اونچی کرسی پر براجمان تھے۔ سارے کوارٹرس آس پاس تھے۔ شام کے وقت سارے بچے چند گھنٹے ان کواٹروں کے کمپاؤنڈ میں کھیلتے تھے لیکن ایک کواٹر کا کمپاؤنڈ ویران پڑا رہتا۔ کبھی کبھی قدرے بڑی لڑکی سر پر سفید پلو ڈالے دروازے سے جھانکتی رہتی۔

وہ روزانہ اسے ایک ہی جلسہ اور ایک ہی پوز میں دیکھتی آخر ایک دن اس نے نرملا سے پوچھا۔''یہ لڑکی جو جھانکتی رہتی ہے وہ کون ہے؟''

''ارے تم نہیں جانتیں؟'' نرملا نے تعجب سے پوچھا۔''یہ کسم دیدی ہیں۔ بے چاری بال بدھوا ہیں۔''''یہ بال بدھوا کیا ہوتا ہے؟ یہ لفظ اس کے سر

کے اوپر سے گزر گیا۔ لیکن اسے جستجو ہوگئی۔

گھر آکر اس نے دادی اماں سے پوچھا۔ ''دادی اماں یہ بال بدھوا کیا ہوتا ہے؟'' انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ الٹی سیدھی باتیں تمہیں کون بتاتا ہے۔''

وہ ذرا توہم پرست تھیں۔ انسان چاہے جس ذات، جس ماحول کا ہو زمانے کا اثر اس کی سوچ پر یکساں پڑتا ہے۔ ''نرملا بتا رہی تھی، وہ جو سامنے والے کواٹر میں دیدی رہتی ہیں ''نا'' وہ بال بدھوا ہیں۔''

''ہوگی تم جان کر کیا کروگی؟'' انہوں نے خفگی سے کہا۔ ''ہاں مجھے جاننا ہے بتائے نا دادی اماں۔'' وہ بضد تھی۔ ''وہ اچھے کپڑے بھی نہیں پہنتیں، باہر بھی نہیں آتیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ کھیلتی بھی نہیں ہیں۔''

اس کی ضد کے آگے دادی اماں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''بٹیا! بچوں کو یہ سب جاننے کی کیا ضرورت ہے مگر تم تو ہر بات کی ضد پکڑ لیتی ہو۔ ارے وہ بیچاری ابھاگن ہے۔ اب اس کا شوہر دنیا میں نہ رہا۔ اگر اب وہ بن سنور کر رہے گی تو دنیا کیا کہے گی۔ کیا سماج اسے جینے دے گا۔'' خدا نے ہی یہ حق اس سے چھین لیا ہے۔''

''دادی اماں! کیا اب ان کی شادی نہیں ہوسکتی۔؟'' اس روز وہ ان سے سوال در سوال کرتی جارہی تھی۔ ''ہاں کہہ تو دیا سماج اسے یہ حق نہیں دیتا ہے۔''

''یہ کیسی منطق ہے؟ وہ دیر تک غور کرتی رہی۔ ''اماں مر گئیں تو ابا نے کیسے دوسری شادی کرلی؟'' وہ بیچاری کیا جانے کہ معاشرے نے مرد اور عورت کے لئے الگ الگ قانون نافذ کیا ہے۔ خاص کر ہندو سماج نے تو عورتوں کو یہ

حق دیا ہی نہیں ہے۔ چاہے وہ بربادیوں کی انتہا تک کیوں نہ پہنچ جائیں۔

پہلے تو ہندو مذہب میں ستی ہونے کا رواج تھا یعنی پتی کے ساتھ پتنی کو بھی جلا دیا جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے جنہوں نے اس رسم کو ختم کیا۔

ooo

کسم دیدی کی کہانی سن کر اس کا دل چاہا کہ وہ انہیں پاس سے دیکھے۔ اور آخر ایک دن اس شوق نے اسے ان کی دہلیز پر لا کھڑا کر دیا۔ دستک دینے پر شاید وہی دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھیں۔ تبھی ایک کرخت آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ ''منحوس ہر جگہ آگے ہو جاتی ہے۔''

پھر ایک ہاتھ نے انہیں پرے ڈھکیل دیا۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے یہ نظارہ دیکھا اور دم بخود رہ گئی۔ پہلا تاثر ہی لرزہ خیز تھا۔ پھر کچھ دنوں تک وہ وہاں جانے کی ہمت نہ کر سکی لیکن پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے آمد و رفت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کسم دیدی اسے بہت اچھی لگتیں۔ وہ تھیں اتنی جاذب نظر کہ کوئی بھی انہیں دیکھ کر نظریں ہٹانا بھول جاتا۔ گورا چٹا رنگ، پتلی پتلی گردن، ہونٹ جیسے گلاب کی گلابی پنکھڑیاں۔ بائیں گال میں ننھا سا ڈمپل۔ جب ہنستی تو غضب ڈھاتیں۔ لیکن وہ ہنستی ہی بہت کم تھیں۔ اگر غلطی سے کبھی ہنس دیتیں تو ماں اور دیدی کے نظروں کا تیر ان کے جگر کے آر پار ہو جاتا۔

وہ اکثر وہاں جاتی اور ان سے گھنٹوں باتیں کرتی رہتی لایعنی اور بے ضرر سی باتیں۔

ایک دن انہیں رنگین ساری پہنے دیکھ کر اسے تعجب ہوا اور خوشی بھی۔

''دیدی اس ساری میں آپ کتنی جچ رہی ہیں۔ اب سفید ساری کبھی نہ پہنیے گا۔'' ان کا پلو پکڑ کر اس نے کہا۔

''اسی لئے تو ہمارے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا لیکن ماں اور دیدی کے منع کرنے پر بھی بابو جی میرے لئے کئی رنگین ساریاں لے آئے۔ اگر اس گھر میں کسی کو میری پروا ہے تو وہ بابو جی ہیں۔ وہ میرے لئے بہت کچھ سوچتے ہیں۔ مجھے تعلیم دلوانا چاہتے ہیں تا کہ سماج میں میری کوئی عزت ہو۔ میں تعلیم کے ذریعہ پہچانی جاؤں۔ ایک دن وہ اچھلتی کودتی آئی اور کسم دیدی کے گلے میں باہیں ڈال کر مٹھی میں دبا ہوا کاغذ ان کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر بولی۔ ''دیدی دیکھئے میں آپ کے لئے کیا لائی ہوں۔'' کیا لائی ہو؟ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہ سرکس کا ٹکٹ ہے، آپ ہمارے ساتھ سرکس دیکھنے چلیں گی نا؟''

کچھ دیر تک وہ خاموشی سے سوچتی رہیں پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کہا۔ ''نہیں، میں تو نہیں جا سکتی۔''، ''کیوں؟''، ''کیونکہ کوئی بھی منورنجن میرے لئے پاپ ہے۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ ان کے انکار سے وہ مایوس ہوگئی۔ کچھ دیر تک غور سے انہیں دیکھتی رہی پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا کہ پوچھ بیٹھی۔ ''دیدی آپ نے اپنے پتی کو دیکھا تھا؟'' ان کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا پھر خود کو سنبھال کر کہا۔ ''بس ایک جھلک کیونکہ ابھی میرا گونا نہیں ہوا تھا۔''، ''وہ کیسے مر گئے، انہیں کیا ہوا تھا۔''، ''ملک کی آزادی پر بھینٹ چڑھ گئے۔'' انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ''کیا؟'' وہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے کسم دیدی کو دیکھنے لگی۔

''تم ابھی چھوٹی ہو گڑیا یہ سب باتیں نہیں سمجھ پاؤ گی۔ ''بتاؤ نا دیدی!

اب میں اتنی بھی چھوٹی نہیں ہوں پورے دس سال کی ہوچکی ہوں۔''، ''اوہ تو اب میری گڑیا سیانی ہوگئی ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ پھر قدرے وقفے کے بعد گویا ہوئی۔''جب ملک کی آزادی کے لئے اندولن چلا تھا تو ہمیں بہت ساری قربانیاں دینی پڑی تھیں۔ نہ جانے کتنی ماؤں کی گود سونی ہوگئی تھی۔ کتنی جوان عورتوں کی مانگ کا سندور اجڑ گیا تھا۔ ان ہی بدنصیبوں میں ایک میں بھی ہوں اس وقت ان کے چہرے پر درد کی پرچھائیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

OOO

اندنوں کسم دیدی کی بڑی بہن کے گونا کی تیاری چل رہی تھی۔ گھر میں خوب گہما گہمی تھی۔ رسم و ریت کا دور شروع ہوچکا تھا۔ لیکن کسم دیدی خاموشی سے ایک طرف پڑی رہتیں۔ انہیں اس شبھ کاموں میں ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں تھی کہ شبھ کاموں میں ابھاگن کا کیا دخل جیسے برہمنوں کی سبھا میں اچھوت کا گزر نہیں۔

انہیں اس حال میں دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی''دیدی گھر میں اتنی چہل پہل ہے لیکن آپ ایک کنارے اداس بیٹھی رہتی ہیں۔ ان دلچسپیوں میں حصہ کیوں نہیں لیتیں۔''

''میں تمہیں کیا کیا بتاؤں۔ اگر شگون کی چیزوں میں غلطی سے بھی میرا ہاتھ چھوجائے گا تو بڑا ہی انرتھ ہوجائے گا۔'' انہوں ن ے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

ان کی بات سن کر وہ خاموش ہوگئی۔ اسے یہ سب جان کر بڑا عجیب سا لگا دیر تک سوچتی رہی لیکن دس سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے ان باتوں کو سمجھنے اور دخل دینے کی یہ تو وہ اب سوچتی ہے کہ کیسا رسم و رواج تھا کہ ایک بیٹی کی شبھ

کامناوں کے لئے دوسری بیٹی کے دل کو ریت رواج کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کیا جارہا تھا۔ لیکن وہ لوگ بھی کیا کرتے رواج کے شکنجے میں جکڑے تھے۔ بہرحال دیدی سسرال چلی گئیں اور جاتے جاتے اتنا کرم کر گئیں کہ کسم دیدی کی زندگی میں جو سختیاں تھیں ان میں تھوڑی تھوڑی نرمی کی حلاوت شامل ہوگئی تھی۔ اب ان کی پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ایک ماسٹر انہیں پڑھانے کے لئے گھر آنے لگا۔

کچھ دنوں بعد ان کے بابو جی کا وہاں سے ٹرانسفر ہوگیا اور دیدی وہاں سے چلی گئیں، اسے جدائی کا غم دے کر۔

ooo

اندنوں وہ نئی امی کے میکے گئی ہوئی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھی کہ اچانک ایک واقعہ پیش آگیا جس نے اس کے اندر بہت ساری تبدیلیاں پیدا کردیں۔ ہوا یہ کہ گاؤں میں میلہ لگا ہوا تھا سارے بچے میلہ دیکھنے جارہے تھے وہ تو تھی ہی کھلنڈری اس کا دل بھی میلہ دیکھنے کے لئے مچلا۔

''میں بھی میلہ دیکھنے کے لئے جاؤں؟'' اس نے امی سے اجازت لی۔ وہ بیچاری تو خاموش ہی رہیں ابھی کچھ بول بھی نہ پائی تھیں کہ ایک کرخت آواز پیچھے سے آئی۔

''تم میلہ دیکھنے نہیں جاؤ گی۔'' مغلانی جی نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا، مغلانی جی حکم صادر فرمارہی تھیں اور اپنی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ وہ تھرا گئی لیکن خود پر قابو

پاتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہیں جاؤں گی؟'' میں تو ضرور جاؤں گی۔ ''غضب خدا کا کیسی ڈھیٹ لڑکی ہے، ذرا بھی کسی کا ڈر خوف نہیں۔ دیکھتی ہوں تم کیسے جاتی ہو۔'' لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی اور جیسے ہی جانے کے لئے قدم بڑھایا، مغلانی جی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا وہ زمین پر گر پڑی اور لوٹ لوٹ کر رونے لگی۔ یہ اس کی انا پر ضرب کاری تھی۔ اگر امی اسے سمجھا دیتیں تو شاید وہ مان جاتی۔ روتے روتے وہ نیند کی وادی میں پہنچ گئی، جہاں دو ڈراونی آنکھیں اب بھی اسے گھور رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی دیر وہ روتی رہی جب نیند سے بیدار ہوئی تو ان چند گھنٹوں میں شعور کی کئی منزلیں طئے کر چکی تھی۔ اس کی شوخی اس کا چنچل پن نہ جانے کہاں کھوگیا تھا اب وہ بالکل خاموش ہوگئی تھی۔ اس کی اس تبدیلی کو کسی نے محسوس نہ کیا اور اگر کسی نے محسوس کیا بھی ہوگا تو اس سے تبدیلی کا سبب جاننے کی کوشش نہ کی۔ ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سوچا۔ ''وہ اتنی اہم کب ہے۔''

یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آگئی کہ بن ماں کے بچے کو ہر کوئی اپنی جاگیر سمجھتا ہے اور اپنے طور پر اسے استعمال کرنا چاہتا ہے۔

اب وہاں سے اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ یہاں سے جانے کے دن گن رہی تھی۔ دادی اماں کو بھی گاؤں گئے ہوئے چھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا اور اب ان سے ملنے کے لئے دل چاہ رہا تھا لیکن فی الحال وہاں جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بس یہ ایک اتفاق تھا کہ چھوٹے ابا اسے گاؤں لے جانے کے لئے آگئے اور پھر یہ بھی ہوا کہ اسی وقت ابا کے ٹرانسفر کا آرڈر آگیا اور بس آرڈر آتے ہی بوریا بستر گول کر کے خانہ بدوشوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوجانا پڑتا تھا۔ ایسے موقع پر ابا جب تک سٹل نہیں ہوجاتے، فیملی کو

اپنے پاس نہیں بلواتے۔ اس لئے اسے دادی اماں کے پاس زیادہ دنوں تک رہنے کی امید تھی۔ وہاں شادی کی تقریب تھی اس موقع پر وہ جارہی تھی اس لئے بہت خوش تھی۔

ooo

ہر بار کی طرح اس بار بھی چلتے وقت وہ مسرور تھی اور اکسائٹڈ بھی۔ گاؤں جانے والے راستے سے وہ بہت مانوس تھی جب وہ گاؤں کے حدود میں داخل ہوئی تو شام ہورہی تھی پگڈنڈی کے دونوں طرف ہرے بھرے کھیت لہلہارہے تھے چرواہے اپنے مویشیوں کو ہانکتے ہوئے لے جارہے تھے مزدور عورتیں اپنے جانوروں کے لئے چارہ کا گٹھر سر پر اٹھائے، تیز تیز قدموں سے اپنے گھروں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پرندوں کے جھنڈ اپنے گھونسلوں کی طرف محو پرواز تھے، پیپل کے پیڑ کے پیچھے سورج غروب ہورہا تھا جس کی لال کرنیں ہر طرف پھیل رہی تھیں۔ یہ مناظر اسے بہت سہانے اور دلفریب لگتے تھے۔

جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچی تو مغرب کا وقت ہورہا تھا اذان کی خوش الحاں آواز اس کے کانوں کو بھلی لگ رہی تھی کیونکہ اس آواز سے اس کے بچپن کی بہت ساری یادیں وابستہ تھیں۔ اذان کے وقت جب سارے بچے مل کر ہلا غلا مچاتے تو اسے ڈانٹ پڑتی اور کبھی ایک آدھ تھپڑ بھی کھانا پڑتا کیونکہ وہ سب سے بڑی تھی۔ پھر اسے نصیحت کی جاتی کہ اذان کے وقت خاموش رہنا چاہئے اور دھیرے دھیرے دعا مانگنی چاہئے کیونکہ وہ قبولیت کا وقت ہوتا ہے اس وقت کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔

دروازے پر دادی اماں اس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی سینے سے لگالیا اور پیشانی چومنے کے لئے اس کا سر اوپر اٹھایا تو دھک سے

رہ گئیں۔ ''نوشین کیا تیری طبیعت خراب ہے۔ تیرا چہرہ اتنا مرجھایا ہوا کیوں ہے؟'' ''نہیں دادی اماں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سفر کی تکان کی وجہ سے آپ کو ایسا محسوس ہو رہا ہے۔''، ''ٹھیک ہے مریم سے کہوں گی کھانے کے بعد تمہیں تیل مالش کر دے۔'' اتنے لمبے سفر سے بچہ آئی ہے۔'' نوشین نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور دادی اماں کی محبت میں گردن گردن تک ڈوب گئی۔

دوسرے دن ظفر چچا کی بارات تھی چھوٹے ابا نے پوچھا۔ ''نوشین بارات میں چلے گی؟''

اگر پہلے والی بات ہوتی تو وہ خوشی سے ناچنے لگتی لیکن اب وہ بالکل بدل چکی تھی۔ ''نہیں چھوٹے ابا دادی اماں کہتی ہیں، سیانی لڑکیوں کو مردوں کی محفلوں میں نہیں جانا چاہئے۔''

چھوٹے ابا ایک ٹک اس کا منہ دیکھتے رہے، انہیں اس کی بات سن کر عجب بھی ہوا اور افسوس بھی۔ اتنی ہنستی کھیلتی بچی ایک دم اتنی خاموش اور مایوس کیوں ہوگئی کون سے سانحہ نے نے اسے بدل کر رکھ دیا۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی اس نے کتاب، کاپی اور قلم سنبھال لئے۔ اس میں بہت چینجز آگئے تھے۔ اب پڑھنے لکھنے سے اسے کافی دلچسپی ہوتی جارہی تھی دادا ابا کے کمرے میں کتابوں سے بھری الماری تھی۔ دراصل اس کے آبا و اجداد کے خون میں علم و ادب کا مادہ بھرا تھا۔ سو دادا ابا اپنی انہی دلچسپیوں سے اپنا وقت گزارتے تھے اور اپنی الماری میں کتابوں کا ذخیرہ جمع کرتے رہے تھے۔ وہ ان کی الماری سے اپنی پسند کی کتابیں نکالتی اور پڑھتی رہتی۔

ooo

GOVT. URDU LIBRARY, PATNA

ابھی اسے گاؤں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اچانک وہاں کی فضا مسموم ہونے لگی۔ عجیب سی اداسی چھانے لگی تھی۔ اکثر کچھ لوگ جمع ہوکر کسی خاص موضوع پر تبصرہ کرتے رہتے۔ کبھی ایک بڑی سی جیپ وہاں آتی جس پر چند افراد ہوتے جو بھاشن دیتے۔ پمفلیٹس بانٹتے۔ گاؤں کے بچے جیپ کے گرد جمع ہوجاتے۔ اسی زمانے میں گاؤں میں گاڑی وغیرہ آنا بچوں کے لئے ایک تماشا ہوتا تھا۔ پھر ہر طرف سے طرح طرح کی سنسنی خیز خبریں آنے لگیں، اسی اثنا میں آس پاس کے چھوٹے چھوٹے گاؤں سے پناہ گزیں آنے لگے حالانکہ اس کا گاؤں بھی زیادہ بڑا نہ تھا لیکن وہاں کے باشندے پڑھے لکھے اور مہذب تھے وہ دوڑ دوڑ کر تماشا دیکھنے جاتی۔ وہاں اس وقت اسے یہ سب تماشا ہی لگ رہا تھا۔ حالات کی سنگینی کا اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے بلوائیوں نے اس گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا، اب خطرہ لوگوں کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ موت ان کے سامنے ناچ رہی تھی۔ وہاں کے باشندے بہت ہی خوف زدہ تھے۔ وہ بھی ڈری سہمی سی ہر وقت دادی اماں کا پلو پکڑے رہتی اور کبھی کبھی انہیں دلاسا بھی دیتی۔

''پریشاں نہ ہوں دادی اماں!، یہ ہے نا'' وہ اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کی طرف اشارہ کرتی، تب دادای اماں اس کی اس معصوم ادا پر اسے لپٹا کر پیار کرتیں۔ آہیں بھرتیں، ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ نہ جانے کون ممکنہ منظر ان کی نظروں کے سامنے آجاتا۔

دو دن اور دو راتیں وہ لوگ دشمنوں کے حصار میں رہے یہ وقت ان پر بڑا بھاری تھا۔ ان سے مقابلہ آسان نہ تھا، ان کے پاس صرف سات بندوقیں تھیں اور دشمن سات سو سے زیادہ۔ پھر ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ خود کو

نہ بچا پائیں تو عورتیں کوئیں میں چھلانگ لگا کر جان دے دیں گی اور مرد مقابلہ کرتے ہوئے شہادت کا درجہ پالیں گے۔

پھر اللہ کا بڑا کرم ہوا کہ، اپنے ہی گاؤں کے ایک شخص جو پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے، انہوں نے رپورٹ لکھوائی کہ، فلاں فلاں گاؤں میں حالات قابو سے باہر ہورہے ہیں۔ فوری طور پر وہاں فورس بھیجی جائے۔ چنانچہ ملیٹری وہاں پہنچ گئی۔ لوگ ملیٹری کی حفاظت میں آگے بڑھ رہے تھے اور بلوائی ہاتھوں میں اسلحہ لئے ان لوگوں پر لپک رہے تھے۔

یہ تو وہ زمانہ تھا کہ پناہ گزیں ملیٹری کی پناہ میں محفوظ تھے اگر یہ زمانہ ہوتا تو خود ملیٹری ہی انہیں چیر پھاڑ کر کھاجاتی۔

خدا خدا کر کے سب لوگ بحفاظت تمام شہر پہنچے۔ وہاں حالات نارمل تھے لیکن کیمپ وغیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے سب لوگ بکھر گئے جہاں جس کی سمائی وہیں گھس گیا۔ وہ اور اس کے گھر والے جس وقت گاؤں سے نکلے تھے ان کے پاس وہی ایک ایک کپڑا تھا جو ان کے جسم پر تھا۔ اور چھوٹے ابا کی جیب میں کچھ پیسے تھے جو ناکافی تھے لیکن پیسہ کا کوئی مسئلہ نہ ہوا دراصل چھوٹے ابا نے اس علاقے میں سڑک بنوانے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا اور سارا انتظام اور حساب کتاب منشی جی کے ہاتھوں میں تھا۔ انہوں نے ہی رہنے کا انتظام کیا اور کھانا بھی ان ہی کے گھر سے بن کر آتا تھا۔

جس گھر میں ان لوگوں کا قیام ہوا تھا اس گھر کی عورتیں بہت ہی نکچڑھی، مغرور اور بد اخلاق تھیں۔ انہیں خوفِ خدا بالکل نہ تھا، یہ احساس نہ تھا کہ یہ افتاد کبھی بھی کسی پر آسکتی ہے۔ وہ ہر کام ہر بات پر اعتراض کرتیں۔ یہ کیوں ہوا وہ کیوں ہوا۔

ایسے موقعوں پر چھوٹی اماں تو خاموش ہی رہتیں لیکن دادی اماں سے برداشت نہ ہوتا وہ اپنے گھر کی رانی تھیں مجال نہیں کہ کوئی ان کے خلاف بول دیتا وہ تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔

حالات کے اس گرداب میں پھنس کر وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہتیں ''بابو! خدا نہ کرے ایسا وقت کسی پر آئے ہم بھی اپنے گھر کے بادشاہ تھے حکمراں تھے۔ نوکر چاکر، حالی موالی ہر وقت آگے پیچھے لگے رہتے۔ یہ تو ہمارے لئے ایک آزمائش ہے اور تمہارے لئے نیکی کمانے کا ایک ذریعہ ہم کوئی زندگی بھر تھوڑے ہی تمہارے گھر پڑے رہیں گے۔ ہمیں تو صرف حالات کے سازگار ہونے کا انتظار ہے اور واقعی جیسے ہی حالات موافق ہوئے وہ لوگ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ سفر آرام سے طئے ہوگیا۔ کوئی پریشان کن واقعہ رونما نہیں ہوا اور اب وہ لوگ وہاں پہنچے جہاں چھوٹے ابا کا اعلیٰ پیمانے پر بزنس تھا۔

ooo

وہاں آئے ہوئے اسے ایک ماہ سے زیادہ ہو چکا تھا اور ابھی نہ جانے اور کتنے دنوں تک وہاں رہنا تھا کیونکہ ابا کسی محفوظ جگہ ٹرانسفر کروانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ نئی جگہ نئے ماحول میں کسی کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ دادی اماں تو جیسے جلے پیر کی بلی بنی دالان سے کمرہ اور کمرے سے دالان کا چکر لگاتیں اور آہیں بھرتیں۔ ''خدا غارت کرے ان فرنگیوں کو جنہوں نے جاتے جاتے لوگوں کو گھر سے بے گھر کردیا ہے۔'' وہ جلے دل کا پھپھولا پھوڑتیں۔

وہ چین سے ایک جگہ بیٹھنے والی کب تھیں۔ صبح اٹھتیں ضرورتوں سے فارغ ہوتیں، پان کا بیڑہ بناتیں، ڈبے میں رکھتیں اور عزیز و اقارب کے گھر

پہنچ جاتیں اور گھنٹوں ان سے ادھر اُدھر کی گپیں کرتیں۔ بھلا وہ ان بندشوں میں کب رہنے والی تھیں۔

ابھی ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ چھوٹی اماں میکے جانے کے لئے پریشان ہوگئیں۔ شاید وہاں کوئی تقریب تھی۔

اب اکثر چھوٹے ابا سے اس موضوع پر تکرار ہوتی اور تکرار جب بڑھ جاتی تو چھوٹے ابا خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چلے جاتے کبھی دادی اماں کہتیں۔ ''یہ لڑکی میرے پاؤں میں بیڑی ہے ورنہ میں اکیلی جان فی الحال کہیں بھی چلی جاتی۔'' دادی اماں کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ نہیں تھے ایک تیر تھا جو دل کے پار ہوگیا۔ وہ سکتہ میں آگئیں۔

دادی اماں جنہیں وہ بے حد عزیز تھیں، ان کی زبان سے ایسے الفاظ سننے کی انھیں توقع نہ تھی۔ شاید وہ بھی حالات سے بہت ڈسٹرب تھیں۔

اسی دوران یہ خبر آئی کہ نانی اماں کا انتقال ہوگیا اور باقی لوگ پاکستان جانے والے ہیں۔ اسے ایک دھکہ اور لگا ان لوگوں سے رہے سہے تعلقات بھی ختم ہوگئے تھے لیکن ان کی ذات سے وابستہ بہت ساری یادیں اسے گھنٹوں رلاتی رہیں۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی تبھی چھوٹی اماں اس کے پاس آئیں اسے گلے سے لگایا پیار کیا اور دیر تک اسے بہلاتی رہیں۔ پھر سمجھا کر کھانا کھلایا۔ وہ غصہ کی تیز ضرور تھیں لیکن ان کا دل بہت ہی نرم تھا۔ اگر کبھی کسی کو سخت سخت بات کہہ دیتیں تو فوراً انہیں احساس ہوجاتا اور پھر دلجوئی کی باتیں کرنے لگتیں۔

ooo

ان لوگوں سے ملاقات ہونے کی امید تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ پھر اچانک خبر آئی کہ خالہ اماں وغیرہ اسی شہر میں آئی ہوئی ہیں۔ بڑی آپا کی رخصتی ہونے والی ہے۔ جو کئی سالوں سے عقد کے بندھن میں بندھی ہوئی تھیں جب خالہ اماں نے بلاوا بھیجا تو اسے فوراً جانے کی اجازت مل گئی۔ جیسے ہی وہ وہاں پہنچی تو سب سے پہلے اس کی نظر استانی جی پر پڑی۔ ''تو یہ خبیث یہاں بھی موجود ہے؟''

اچانک یہ کڑوے کسیلے کلمات اس کی زبان سے پھسل گئے جو شاید کسی شدید جذبے کا ردّ عمل تھے۔ ذہن اور دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ گزرتے وقت کی یادیں اسے مشتعل کرنے لگیں۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے جب وہ آخری بار نانی اماں کے یہاں گئی تھی تو اسے محسوس ہوا تھا کہ خالہ اماں کے یہاں سے کوئی نااتفاقی چل رہی ہے، تب ہی تو وہاں سے کوئی آنا جانا نہیں ہے سوائے نشو آپا اور انی بھائی کے وہ بھی شاید چھپ چھپا کر آتے کیونکہ جلد ہی واپس لے جاتے ان کے چہرے پر ڈانٹ سننے کا خوف عیاں رہتا۔ ورنہ پہلے تو ان دونوں کا زیادہ وقت نانی اماں کے پاس ہی گزرتا تھا کیونکہ دونوں ہی نانی اماں کے لاڈلے تھے اور اس کے لئے نانی اماں کے دل میں دوسری طرح کی محبت تھی وہ ان کی مرحوم بیٹی کی نشانی تھی۔ اس کے چہرے میں انہیں اپنی بیٹی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ بہر کیف اس نااتفاقی کی وجہ جاننے کی اسے جستجو ہوگئی بہت کریدنے پر خود نانی اماں کی زبانی ہی استانی جی کا پورا کچا چٹھا معلوم ہوگیا۔

ooo

وہ گرمی کی ایک چلچلاتی دوپہر تھی پورے آنگن میں تیز دھوپ بکھری تھی، باہر گرم ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ بوا نے دروازہ کھولا اور اپنے ساتھ ایک عورت کو اندر لے کر آ گئی۔

''بی بی یہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔'' نانی اماں نے سر سے پیر تک اسے غور سے دیکھا اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا حلیہ عجیب تھا۔۔ تنگ مہری کا گھٹی سے اوپر سفید پائجامہ، کمر سے ایک بالشت نیچے تک سفید ہی کرتا اور سفید چادر کا دوپٹہ وہ اپنے جسم کے گرد لپیٹے ہوئے تھی۔ ''تمہیں مجھ سے کون ایسا ضروری کام ہے کہ اس تیز دھوپ میں آئی ہو؟''

''باجی مرتا کیا نہ کرتا، کام ہی کچھ ایسا ہے کہ مجھے اس چلچلاتی دھوپ میں آنا پڑا۔ میں نے آپ کی فراخ دلی کے قصے سنے ہیں، اور بہت امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ میں بیوہ بیکس ہوں۔ میرا اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے۔ نہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگہا۔ باجی! خدا آپ کا اقبال اور بلند کرے مجھ لاچار کو اپنے یہاں پناہ دے دیجئے۔''

نانی اماں کچھ دیر تک سوچتی رہیں۔ کوئی ایسا نہ تھا جس سے مشورہ کرتیں، کوئی اپنا پرایہ بہی خواہ نہ تھا۔ پھر اپنے نرم دل اور نرم جذبے سے مغلوب ہوکر انہیں بحیثیت استانی اپنے یہاں رکھ لیا۔ اس وارننگ کے ساتھ کہ ''دیکھو میں نے تمہیں رکھ لیا ہے لیکن اگر تم نے کچھ گڑ بڑ کی تو اس کی ذمہ دار تم خود ہوگی'' استانی جی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''باجی! میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں گی۔''

اپنی اس کامیابی پر استانی جی تو خوش تھیں ہی، نانی اماں بھی ان سے کم

خوش نہ تھیں۔ ہر ایک سے کہتیں۔ ''خدا کا شکر ہے کہ میری بچیوں کی تعلیم کا مسئلہ حل ہوگیا۔'' یہ استانی قرآن کے علاوہ اردو اور حساب بھی جانتی ہے۔ ''بہت اچھا کیا جو آپ نے انہیں رکھ لیا، سنا ہے صوم صلوٰۃ کی بھی پابند ہیں۔'' لوگ اپنے خیال کا اظہار کرتے۔

استانی جی بھی موقع بے موقع اپنی شرافت اور ایمانداری کی دھاک جمانے سے باز نہ آتیں۔ دھیرے دھیرے انہوں نے اپنے قدم جمالیے۔

ooo

اور اب بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ سالوں بیت گیا تھا لڑکیاں سیانی ہوتی جارہی تھیں، ان کی تو ذات ہی ربڑ کے پیڑ کی طرح ہوتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہوجاتی ہیں اور اماں باوا کو فکر میں مبتلا کردیتی ہیں۔ باوا تو خیر سے تھے ہی نہیں۔ جب دونوں بہنیں بہت چھوٹی تھیں تب ہی ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ بھائی بھی ابھی کم عمر تھے۔ ہاسٹل میں رہتے تھے، کبھی کبھی چھٹیوں میں آتے تھے۔ اور ابھی وہ شادی بیاہ کے معاملہ میں دخل دینے کے لائق نہ تھے۔ اب جو کچھ کرنا تھا اماں ہی کو کرنا تھا اور اماں کی نگاہ اپنے بھتیجے پر ٹکی تھی بھلے ہی وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا لیکن اتنی بڑی جائداد کا تنہا وارث تھا۔ بیٹی عیش کرے گی یہ سوچ کر بیٹی کو بھتیجے کے پلے باندھ دیا۔ ویسے نانی اماں بھی کافی جائداد کی مالک تھیں اس کے علاوہ سونے چاندنی کے بہت سارے ساز و سامان ان کے جہیز میں ملے تھے۔ نانا ابا کو بس تھوڑی بہت پروپرٹی تھی لیکن ان کا خاندان علم کی دولت سے مالا مال تھا۔ نانا ابا خود منصف تھے اور ان کے بزرگ بھی اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے جب خالہ اماں کی رخصتی ہونے لگی تو ابھی وہ یہ

بار سہنے کے لائق نہ تھیں کیونکہ وہ بہت ہی کم عمر اور نازک سی تھیں کوئی ساس نند نہ تھیں جو گھر بار سنبھال لیتیں لہٰذا استانی کا دم چھلا ساتھ لگا دیا گیا۔

وہاں بھی انہوں نے دھیرے دھیرے اپنے قدم جمالئے۔ ہر چیز پر قابض ہونے لگیں۔ ہر ایک کو مٹھی میں کر لیا اور مالک مختار بن بیٹھیں۔ خالہ اماں کی کم عمری کا فائدہ اٹھایا۔ کیا صحیح کیا غلط، کیا جائز، کیا ناجائز، سارے فتوے سارے اصول دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ شتر مرغ کی طرح پیٹ میں سر گھسائے یہ سمجھ رہی تھیں کہ کوئی انہیں دیکھ ہی نہیں رہا ہے۔ لیکن تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ہر طرف چہ میگویاں ہونے لگیں لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ نانی اماں اپنی نادانی سے بیٹی کو کھو چکی تھیں۔ اور اب صبر کے سوا چارہ ہی کیا تھا کیونکہ استانی جی نے خالہ اماں کو مٹھی میں لے لیا تھا۔

''اف بیچاری نانی اماں، ان کی زندگی میں آنے والے اس سانحہ کو یاد کر کے وہ افسردہ ہوگئی۔

جب آپا کی رخصتی ہونے لگی تو ایک بار پھر وہی پرانا قصہ دہرایا گیا اور قدم قدم پر انہیں ذلیل ہونا پڑا اور آپا جو ان کی مرید تھیں وہ اپنی زبان نہ کھول سکیں۔

شاید ان کے سسرال والوں کو ان کی ساری کہانی معلوم ہو چکی تھی۔ کہانی اچھی ہو یا بری، بڑی ہو یا چھوٹی حلق سے نکلتی ہے تو خلق تک پہنچ ہی جاتی ہے۔ استانی جی کب یہ ذلت برداشت کرنے والی تھیں بھاگ تو نہیں سکتی تھیں، یہ بھی ان کی شان کے خلاف تھا البتہ وہاں کا کھانا پینا چھوڑ دیا۔ طعام ولیمہ میں جب وہ وہاں گئی تو دیکھا وہ ہوٹل سے منگوا کر حلوہ پوری کھا رہی ہیں۔ وہ دل ہی دل خوش ہوئی اور سوچا جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ حالانکہ انہیں اپنی غلطی

کی بہت ہی کم سزا ملی تھی ورنہ نانی اماں کی آہ تو انہیں کہیں پناہ لینے نہیں دیتی۔

ooo

خدا خدا کر کے ابا کا تبادلہ ایک محفوظ جگہ ہوگیا اور وہ ان کے پاس آ گئی۔

ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ لوگ جوق در جوق پاکستان کی طرف کوچ کررہے تھے۔ نہ جانے یہ خوف کا اثر تھا یا تحفظ کا احساس کہ تیزی سے لوگ اپنے وطن کو الوداع کہہ رہے تھے۔اس وقت وہ کم عمر تھی، سمجھ نہیں پارہی تھی کہ یہ سب کیا کیا ہورہا ہے، کیوں ہورہا ہے۔

اب بھی وہ اس قابل نہیں تھی کہ اتنے بڑے اہم موضوع پر کوئی تبصرہ کرسکے لیکن اتنی بات تو سمجھ میں آہی گئی تھی کہ ملک کی اس تقسیم نے مسلمانوں کو بری طرح تباہ و برباد کردیا۔

جنہوں نے خونی رشتہ چھوڑا، اپنی پہچان اپنا مقام چھوڑا، اس سرزمین کو چھوڑا جہاں ہزارہا برس ان کے آبا و اجداد نے حکومت کی۔ لیکن اس کے بدلے انہیں کیا ملا۔ سالوں گزر جانے کے بعد اب بھی وہ مہاجر کہے جاتے ہیں یہی ان کی پہچان ہے۔

بٹوارے کے بعد جب لوگ پاکستان کی طرف کوچ کررہے تھے تو ان کا رخ زیادہ تر مشرقی پاکستان کی طرف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ہجرت کررہے ہیں لیکن نہیں، انہیں مجبوراً یہ ملک چھوڑنا پڑا تھا۔

دراصل ہجرت تو نبیؐ اور ان کے صحابیوں نے کی تھی اور انہیں بھی مجبوراً ہی اپنا شہر چھوڑنا پڑا تھا۔ لیکن وہ دین پھیلانے کا جذبہ ساتھ لے کر چلے تھے

کوئی دنیاوی کام شامل نہ تھا۔ اگر کوئی انسان کسی نیک کام اور نیک ارادے سے نکلے اور اس میں اس کی اپنی حرص اپنا مفاد شامل ہوجائے تو اصل مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔

OOO

مشرقی پاکستان پہنچ کر کچھ دنوں تک وہ لوگ اپنی گری ہوئی ساکھ بحال کرنے میں لگے رہے اور جب حالات ذرا سدھر گئے تو اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کی جد و جہد میں جٹ گئے یہ بات وہاں کے باشندوں کے دلوں میں کھٹکنے لگی انہیں ایسا لگا کہ کہیں یہ لوگ ہم پر حاوی نہ ہوجائیں۔ انہیں یہ برداشت نہ ہوسکا کہ کوئی دوسرا آکر ان کا حق چھینے، ان پر رعب جمائے، ان کی روایت توڑے، ان کی زبان مسخ کرے۔ یہ کانٹا ان کے دلوں میں چبھنے لگا اور پھر دل کی چبھن ایک دن رنگ لائی۔ نفرت کی چنگاریاں ہر طرف بھڑکنے لگیں۔ وہ ان کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ بربریت کا ایسا ناچ دیکھنے میں آرہا تھا کہ شاید شیطان بھی پناہ مانگ رہا ہوگا۔ ہر طرف لاشوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، تعفن پھیل رہا تھا اور وہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ایک بار پھر ہندوستانی مسلمان لٹ پٹ کر کیمپ میں آگئے۔ جن میں اس کے بہت سارے قریبی رشتہ دار بھی تھے اور سب سے بڑھ کر اس کے اپنے سگے بھائی تھے جو اس کے جان جی سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ چند سال قبل ہی وہ یہاں سے گئے تھے۔ وہ یہاں اچھے خاصے آرام سے تھے پھر نہ جانے ان کے دل میں کیا سمائی یا کسی کے بہکاوے میں آگئے کہ ابا کی سخت مخالفت کے باوجود

اچھی بھلی جاب کو ریزائن کر کے چلے گئے۔ شاید ان کی قسمت میں در بدر ہونا لکھا تھا۔

ان لوگوں پر کیا کیا افتاد نہ پڑی، کون کون سی مصیبتیں نہ جھیلنی پڑیں۔ کئی کئی دنوں تک گھر میں چھپ کر بغیر دانہ پانی کے رہنا پڑا۔ پھر ایک رات اس محلّہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ کہیں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی زندگی کی یہ آخری رات ہے۔ سب لوگ ساری رات جاگتے رہے اور دعائیں مانگتے رہے اور شاید یہ ان کی دعاؤں کا ہی اثر تھا کہ صبح ہونے سے پہلے ملیٹری فورس آ گئی اور ان کی جان بچ گئی۔

مشرقی پاکستان جو اب بنگلہ دیش بن چکا تھا، انہیں اپنے یہاں رکھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اور لوگ خود ہی اتنے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ جلد سے جلد بنگلہ دیش چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو مغربی پاکستان چلے گئے اور کچھ انڈیا آ گئے۔ بھائی کو بھی ابا نے انڈیا بلوالیا۔ اللہ کا کرم رہا کہ انہیں جلد ہی جاب بھی مل گئی۔ اور وہ جنہیں کسی قیمت پر پاکستان جانا گوارا نہ تھا جو اسی ملک کو اپنا وطن مانتے تھے، جنہوں نے ایثار کیا، قربانیاں دیں، ملک کے تئیں اپنی وفاداری نبھائی، سیکولرزم کا راگ الاپتے رہے لیکن پھر بھی آنکھوں کا کانٹا بنے رہے۔ دہشت گرد، ٹررسٹ گردانے گئے جہاں بھی بم بلاسٹ ہوتا، دو چار مسلم لڑکے حراست میں لے لئے جاتے، چاہے وہ اس میں ملوث ہوں یا نہ ہوں۔

اس نے اب تک بہت سارے تغیرات دیکھے تھے اس کی زندگی میں بھی بہت نشیب و فراز آئیں گے وہ سوچتی شاید دنیا اسی کا نام ہے، ابھی نہ جانے اور کتنے نشیب و فراز آئے وہ سوچتی شاید دنیا اسی کا نام ہے، ابھی نہ جانے اور کتنے نشیب و فراز سے اسے گزرنا ہے۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور

ماضی میں لوٹ گئی۔

یہ بھی اس کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس زمانے میں چھوٹے ابا کے بزنس کی ساکھ گر رہی تھی۔ وہ بے حد پریشان تھے اور ان سے زیادہ دادی اماں فکر مند تھیں۔ انہیں پریشان دیکھ کر ان کے کئی رشتہ داروں نے مشورہ دیا کہ ''مخدوم جہاں حضرت شرف الدین یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے روضہ پر جا کر چالیس دن کی چلہ کشی کریں، انشاء اللہ آپ کی مرادیں پوری ہوجائیں گی، اور ساری پریشانیاں دور ہوجائینگی۔''

دادی اماں تو خود ہی نذر ونیاز، در درگاہ اور چلہ کشی میں عقیدت رکھتی تھیں۔ یہ بات ان کے دل کو بھی بھا گئی۔ چھوٹے ابا نے بھی فوراً ہامی بھرلی کیونکہ وہ بھی دادی اماں کے ہم خیال تھے۔ انہیں ان باتوں پر پورا اعتقاد تھا۔ دادی اماں کے ایک پوتے اور ایک پوتی بڑے چہیتے تھے۔ ان میں ایک تو وہ خود دوسرے چھوٹے ابا کے نورِ نظر حسیب سلمہٗ۔ لہٰذا ان دونوں کو بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ ہوا۔ پروگرام مرتب ہونے کے بعد جلد ہی ان چار لوگوں کا قافلہ حضرت مخدوم الملک کے روضہ پر حاضر ہوگیا۔ یہ روضہ ایک بہت بڑے احاطے کے اندر ہے، اسی احاطہ میں بہت سارے کمرے حاجتمندوں کی رہائش کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان ہی کمروں سے ایک میں وہ لوگ رہائش پذیر ہوگئے۔ دادی اماں نے تو اپنی خانہ داری سنبھال لی۔ چھوٹے ابا کا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا۔ وہ صبح وشام روضہ پر حاضری دیتے فاتحہ پڑھتے اور دعائیں مانگتے۔ باقی وقت ان دونوں بھائی بہن کو پڑھانے میں گزارتے۔ وہاں پڑھنے میں بڑا مزہ آتا۔ پڑھائی سے کافی رغبت ہوگئی تھی۔ دونوں نے کافی اشعار یاد کرلیے تھے اور جھوم جھوم کر ترنم سے پڑھتے تھے۔ بہت سارے متضاد اور ہم معنی الفاظ

یاد کر لئے تھے۔ ڈکٹیشن بھی روز لکھتے جس کی وجہ سے املے میں کافی سدھار آ گیا تھا۔ ان چالیس دنوں میں دونوں نے آمدنامہ ازبر کرلیا تھا۔ پڑھائی سے فرصت ملتی تو دونوں کمپاؤنڈ میں نکل جاتے۔اس احاطے میں روز ہی نئے نئے تماشے دیکھنے میں آتے۔کبھی کوئی شخص زنجیروں میں جکڑا ہوا روضہ پر لایا جاتا اس کے ہاتھ پاؤں تو بندھے رہتے لیکن وہ منہ سے اناپ شناپ بکتا رہتا۔کبھی کوئی کم عمر لڑکی جس کے بال کھلے ہوتے، وہ روضہ کی دیوار کی جالی سے لگی جھومتی رہتی۔ اس کے چاروں طرف اگربتی اور لوبان کی مہک پھیلی ہوتی، مجاور نیم کی ٹہنی سے مار مار کر اس کا بھوت بھگاتا۔ اگر اتفاق سے دادی اماں کبھی اسے اس لڑکی کے پاس دیکھ لیتیں تو پھر اس کی تو شامت ہی آجاتی کیونکہ وہ بہت ہی توہم پرست تھیں۔ جمعہ اور جمعرات کے دن کا منظر بہت ہی پرکشش ہوتا۔ ڈھول باجے کے ساتھ کچھ لوگ مزار پر چادر چڑھانے کے لئے آتے اور بچوں میں مٹھائی تقسیم کرتے، بچوں کا مجمع انہیں گھیرے رہتا۔ وہ دونوں بھی ان میں شامل ہوجاتے۔

شام کے وقت اکثر وبیشتر دونوں احاطے کے اندر کھیل کود دوڑ دھوپ میں مگن رہتے۔ وہاں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ

''اب تم بڑی ہوگئی ہو، اب بچی نہیں رہی اب تمہیں اچھلنا کودنا زیب نہیں دیتا۔''

البتہ ممکن تھا کبھی دادی اماں کی پیار بھری ڈانٹ کھانی پڑتی مگر انہیں ابھی یہ دھیان کہاں تھا، وہ تو ہر وقت چھوٹے ابا کی ترقی کے لئے نماز اور دعا پڑھتی رہتیں۔

بہرکیف یہ اس کی زندگی کے بہت ہی یادگار دن تھے جسے وہ کبھی بھلا

نہیں سکے گی۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد پھر وہی شب و روز تھے وہی تنہائی تھی۔ چھوٹے ابا بزنس کے سلسلے میں وہاں سے چلے گئے۔ حسیب بھی اپنی امی کے پاس روانہ ہوگئے۔ لیکن اس نے پڑھائی لکھائی کا سلسلہ ختم نہ کیا کہ یہی تو اس کی دلچسپی کا مرکز تھا۔

OOO

ابھی جہان آباد کی پوسٹنگ تھی وہ نالندہ ضلع کا ایک سب ڈیویزن تھا۔ راجگیر وہاں سے قریب تھا جو بہار کا ایک ہل اسٹیشن ہے اس کے علاوہ وہ ایک تاریخی مقام بھی ہے جہاں پہاڑ اور جنگل کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ زمانہ بعید میں حضرت شرف الدین یحیٰ منیری رحمت اللہ علیہ برسہا برس اس جنگل میں عبادت کرتے رہے تھے۔

یوں تو وہاں نیم گرم پانی کے متعدد چشمے ہیں جن میں ایک مخدوم کنڈ کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں اس پانی میں بہت شفا ہے، یہ ہر مرض کی دوا ہے۔ دور دور سے لوگ جاڑے کے موسم میں وہاں آتے ہیں۔ ایک دو بار وہ بھی امی وغیرہ کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ اس وقت وہاں زیادہ رش نہیں رہتا تھا۔ آسانی سے رسٹ ہاؤس وغیرہ مل جایا کرتے تھے سب لوگ صبح نماز کے بعد سیر کو نکل جایا کرتے تھے۔ تھک ہار کر جب واپس آتے تو اسی کنڈ میں نہا کر فریش ہوجاتے۔ پھر کھچڑی پکتی، سب لوگ مزے لے لے کر کھاتے۔ وہاں کی کھچڑی اس قدر لذیذ ہوتی کہ نان پلاؤ اس کے آگے ہیچ ہوتا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر سیر کو نکل جاتے پہاڑ پر دور دور تک ٹہلتے اور ٹھٹھر، بن بیر توڑ کر خوب کھاتے۔ کبھی پہاڑ کے دامن میں نیم پختہ سڑکوں پر چہل قدمی کرتے

یہاں تک کہ اندھیرا ہوجاتا لیکن کچھ ڈر، خوف نہ ہوتا۔ زمانہ اس وقت بھی اتنا برا نہ تھا جو آکر گزر چکا تھا۔

اتفاق سے اس کا گاؤں بھی اسی قرب و جوار میں تھا لیکن اب وہ گاؤں ویران اور سنسان پڑا تھا، گھر بھائیں بھائیں کررہا تھا۔ سارا سامان لٹیرے لوٹ کر لے گئے تھے ایسے موقعوں پر ان ہی لوگوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ انہیں نہ تو ملک کی آزادی سے مطلب ہے اور نہ اس کی ترقی سے۔

وہاں کے باشندے کچھ تو پاکستان چلے گئے اور کچھ اس قدر خوف زدہ تھے کہ دوبارہ وہاں بسنے کی ہمت ہی نہیں جٹا پارہے تھے لیکن اتنی ساری زمین اور جائداد کو کیسے چھوڑ دیتے۔ جب حالات کسی حد تک سازگار ہوئے تو دھیرے دھیرے لوگ جمنے لگے اور تقریباً دس گھر وہاں آباد ہوگئے وہاں جانے اور اس اجڑے ہوئے دیار کو ایک آخری بار دیکھنے کے لئے اس کا دل تڑپ رہا تھا۔ اپنے گاؤں کی بربادی کا اس نے بہت زیادہ اثر لیا تھا۔ وہ بچپن سے ہی بہت حساس تھی اور اب تو پورے تیرہ سال کی ہوچکی تھی شاید مطالعہ کا شوق اور عادتوں نے اس کے ذہن کو قبل از وقت جلا بخشی تھی۔

جس عمر میں لڑکیاں مختلف کھیلو ں سے اپنا دل بہلاتی ہیں وہ مختلف رسالے اور کتابیں کہیں کہیں سے اکٹھا کرتی اور اپنا وقت اسی مشغلے میں گزارتی۔

تقریباً تیرہ سال کی عمر میں اس نے دو چار افسانے لکھ ڈالے لیکن اپنے اس شوق میں وہ کہاں تک کامیاب رہی، اس کا اسے اندازہ نہ تھا کیونکہ گھر کا ماحول ادبی نہ تھا چنانچہ نہ تو کسی نے توجہ دی اور نہ حوصلہ افزائی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے افسانے ردّی کی ٹوکری میں پہنچ گئے اور اس کا سارا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ سارے شوق صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ لیکن اس نے

مطالعہ کی عادت نہ چھوڑی۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ سلائی بنائی میں بھی وقت گزرتا۔ لوگ اسے ستائشی نظروں دیکھتے۔ اچانک اس کی شخصیت بہت اہم ہوگئی تھی۔

ooo

اور جیسے اللہ نے اس کی سن لی وہ دادی اماں کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے گاؤں آگئی۔ اور کچھ لوگ بھی اپنے گھروں میں آباد ہوچکے تھے پھر بھی گاؤں بالکل ویران لگ رہا تھا۔ اس کے گھر کے درو دیوار سے بھی اداسی ٹپک رہی تھی۔ پھر بھی وہ خوش تھی کہ وہاں کی مٹی اور ہوا کی خوشبو اسے تازگی بخشتی تھی اور آج تو وہ بہت زیادہ خوش تھی کیونکہ اس کی سب سے پیاری دوست نادیہ آنے والی تھی۔

کتنا مزہ آئے گا جب دونوں اکٹھے بیٹھ کر اپنی اپنی باتوں کا پٹارہ کھولیں گے۔ وہ باتیں جو بہت دنوں سے ان کے دلوں میں ہلچل مچارہی ہیں۔ وہ آنے والے دنوں کے تصور ہی سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ تبھی ہارن کی آواز آئی وہ دوڑ کر باہر بھاگی۔ اس وقت تک نادیہ گاڑی سے اتر چکی تھی اسے دیکھتے ہی گلے لگالیا۔

''ارے نوشین تم نے تو اپنا قد و قامت خوب نکال لیا ہے ماشاء اللہ چہرے پر بھی نکھار آگیا ہے''

''اب یہ ساری باتیں بعد میں ہوں گی چلو سب سے پہلے منہ ہاتھ دھوکر فریش ہوجاؤ۔''

''کون سا دور سے آئی ہوں، دونوں گاؤں میں بس اتنا ہی فاصلہ تو

ہے جو صرف ایک گھنٹہ میں ہی طئے ہوجاتا ہے۔

اس رات دونوں نہ جانے رات کے کتنے پہر تک باتیں کرتی رہیں۔ کبھی کتابوں کی باتیں، کبھی رشتہ داروں کے قصے اور کبھی بچپن کی یادیں تازہ کرتیں۔"

"جانتی ہو نوشین جب بچپن کے قصے چھڑ جاتے ہیں تو بھیا بھی بہت لطف لیتے ہیں۔ اور تمہارے ذکر پر تو کھل جاتے ہیں۔" مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔" دھت وہ شرما گئی۔

حالانکہ جس پسندیدگی کی طرف اشارہ تھا، اس کے مفہوم سے وہ ابھی نابلد تھی۔ شاید ابھی وہ عمر کی اس دہلیز کو چھو نہ پائی تھی۔ کچھ وقفہ کے بعد نادیہ نے پھر کہا۔

"ارے یار! میرے گاؤں میں تو تمہارے بڑے چرچے ہورہے ہیں۔ تمہاری شخصیت تو بہت اہم ہوگئی ہے۔ لوگ اپنے بچوں کا نام تمہارے نام پر رکھ رہے ہیں۔"

"کہاں کہاں کی ہانک رہی ہو۔ قیاس آریاں کرنی چھوڑ دو نام کسی کی جاگیر نہیں ہوتی ہے۔" وہ اپنی تعریف سن کر شرمندہ ہورہی تھی۔

نادیہ جب تک وہاں رہی وقت کا پتہ ہی نہ چلا کہ یہ پندرہ روز کیسے گزر گئے۔ نادیہ کے جانے کے بعد وہ بھی واپس چلی گئی۔

OOO

جو لوگ وہاں آباد ہوچکے تھے وہ بھی زیادہ دنوں تک وہاں اپنے قدم نہ جماسکے کہ اب وہاں وہ بات نہ تھی، جس پر انہیں ناز تھا جو شرافت، وضع داری

اور بھائی چارہ کی پاسداری کا نمونہ تھا۔ جہاں لوگ ایک دوسرے کے لئے جان کی بازی لگادیتے تھے۔ گویا ساری خلقت ایک ڈور میں بندھی تھی۔ ہر طرف محبت کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی لیکن اب نفرتوں کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔آپس کی محبت میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔

ملک کے بٹوارے کے ساتھ محبت اور اخوت کا بٹوارہ بھی ہو چکا تھا۔

اس کے علاوہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے بھی ان کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔

اور اب اس اجڑے ہوئے دیار میں ساری سہولتیں مہیا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی زمین جائداد اونے پونے اپنے گماشتہ، براہیل اور کمیوں کے ہاتھ فروخت کردی اور جو رعایا تھے ہر وقت جی حضوری میں لگے رہتے تھے اب مالک ہوگئے تھے۔ برابری کے دعوے دار بن بیٹھے تھے۔

ooo

چارسال بعد ایک بار پھر ابا کا ٹرانسفر ہوگیا۔ اس بار پھر انہیں اپنے جوار سے بہت دور بھیج دیا گیا تھا۔

آج ہی وہ لوگ وہاں پہنچے تھے۔ سامان ہر طرف پھیلے ہوئے تھے جسے کھول کھول کر سٹ کیا جارہا تھا لیکن اسے اس کام میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ اس کی فطرت کا خاصہ تھا کہ وہ نئی جگہ جلد ایڈجسٹ نہیں کر پاتی تھی۔ اس بار بھی اس کا یہی حال تھا۔ وہ بے چین روح کی طرح سارا دن پورے گھر میں چکر لگاتی رہتی، جب تھک جاتی تو باہر ڈرائینگ روم میں جاکر بیٹھ جاتی۔ کہیں دور

سے آتی ہوئی میوزک کی آواز سے دل بہلاتی۔ محمد رفیع اور طلعت محمود کی آواز میں فلمی غزلیں سنتی رہتی اسے غزل سننے کا بڑا شوق تھا۔ یہ اس کی روح کی غذا تھی۔ اسے یاد آتا کہ جب وہ چھوٹی تھی تو نہ جانے کس کے ساتھ فلم ''پکار'' دیکھنے گئی تھی۔ اس فلم کے دو سین اسے اب تک یاد تھے۔ ایک ہیروئن کا کبوتر اڑانا اور دوسری یہ غزل ؛ زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے۔ بج رہا ہے اور بے آواز ہے۔ اس غزل کی تشریح تو وہ اب تک نہ کرسکی۔ ہاں اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ کہ غزل میں کوئی بات کوئی پیغام ضرور تھا۔ پھر دھیرے دھیرے ان لوگوں کا حلقۂ احباب بڑھتا گیا اور وہ اس ماحول سے مانوس ہوتی گئی۔ گرچہ اب بھی وہ وہاں کے لوگوں میں مکس اپ نہیں ہو پارہی تھی کیونکہ وہ خالص مسلم ماحول سے ایک دم غیر مسلم ماحول میں آگئی تھی۔

پاس ہی میں ایک مسلم ڈاکٹر اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے کبھی کبھی امی وہاں جاتیں تو وہ بھی بن ٹھن کر تیار ہوجاتی اور وہاں جاکر خاموش بیٹھی بور ہوتی رہتی۔ اسے اپنی بیوقوفی پر غصہ آتا کہ آخر وہ یہاں آتی ہی کیوں ہے۔ اس کی ہم عمر کوئی لڑکی وہاں نہ تھی۔ ان کی بچیاں ابھی چھوٹی تھیں لیکن اتفاق سے ان کی بھانجی کچھ دنوں کے لئے وہاں آگئیں۔ جب وہ پہلی بار ان سے ملی تو کوئی خاص متاثر نہ ہوئی، وہ ایک سیدھی سادی دیہاتی قسم کی عورت تھیں لیکن جب دوسری اور تیسری بار ملی تو ان کی کئی خوبیاں کھل کر سامنے آئیں۔ وہ بہت ہی خوش اخلاق اور خوش گفتار تھیں۔ بہت ہی صاف ستھری اور شستہ اردو بولتیں۔ لب و لہجہ اور انداز بیان بہت ہی خوبصورت ہوتا۔ ان کی فطرت میں حسِ مزاح بھی تھی۔ ان ہی خوبیوں سے متاثر ہوکر وہ ان سے بہت جلد گھل مل گئی۔

وہ اپنے ساتھ بہت ساری کتابیں لائی تھیں۔ اس کی دوستی کی اصل وجہ

شاید یہ کتابیں بھی تھیں۔ وہ کافی دیر تک وہاں کتابیں پڑھا کرتی۔

ایک دن اچانک بے وقت اسے دیکھ کر شمسہ باجی کھل اٹھیں۔ ''ارے نوشین! اس وقت کیسے آنا ہوا؟

''بس آپ کی یاد آئی اور میں آپ کے پاس پہنچ گئی پھر وہ کبھی کی سنی ہوئی غزل گنگنانے لگی:

زندگی جب بھی تری بزم میں لاتی ہے مجھے یہ زمیں چاندسی اکثر نظر آتی ہے مجھے

شمسہ باجی نے ایک دھول اس کی پیٹھ پر جمایا۔ ''بڑی شاعرہ بن گئی ہیں۔'' ''یہ سب آپ ہی کی صحبت کا تواثر ہے شمسہ باجی۔''

باتوں باتوں میں وہ اکثر اپنے شوہر کا ذکر بھی کرتیں اور ان کے حوالے سے بڑی دلچسپ باتیں کیا کرتیں۔ لیکن ان کے دورانِ قیام میں وہ ایک بار بھی وہاں نہیں آئے۔

''شمسہ باجی! آپ کے شوہر یہاں کیوں نہیں آتے۔ کیا آپ سے ملنے کے لئے ان کا دل نہیں چاہتا؟'' تب وہ بڑے پر مذاق انداز میں مسکرا کر کہتیں۔

''ارے یہ شاعر ادیب قسم کے لوگ، خدا انہیں عقل سلیم عطا کرے ان لوگوں کی رفیق حیات تو ان کی شاعری، ان کی افسانہ نویسی ہوتی ہے۔''

'' آپ انہیں کچھ نہیں کہتیں۔'' ''ہاں'' کبھی کبھی جب میں شکایت کرتی ہوں تو وہ بڑی ہی معصومیت سے کہتے ہیں،، ویسے ان کا تخلص بھی معصوم ہے۔

ooo

شمسہ باجی کی کمی پوری کرنے کے لئے اس نے پڑوس والی دونوں لڑکیوں سے رابطہ بڑھالیا۔ ان میں بڑی کا نام کامنی اور چھوٹی کا یامنی تھا۔ یامنی تو کالج میں پڑھتی تھی لیکن کامنی کو نہ جانے کیوں تعلیم سے بے بہرہ رکھا گیا تھا۔ وہ گھر کا کام کرتی اور باقی وقت ہندی پتریکا پڑھتی اور کچھ لکھتی رہتی۔ ''یہ ہر وقت تم کیا لکھتی رہتی ہو؟''

بہت دنوں سے اس کی زبان پر اٹکا ہوا یہ سوال ایک دن پھسل ہی گیا۔ ''پریم پتر لکھتی ہوں'' تھوڑا شرماتے تھوڑا مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا؟ کسے لکھتی ہو۔'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کسی کو بھی نہیں'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''پھر کیوں لکھتی ہو۔'' وہ سوال پر سوال کررہی۔ ''بڑا مزہ آتا ہے تم بھی لکھ کر دیکھو۔''

وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی، جیسے اسے زبردست جھٹکا لگا ہو۔ ''ایسا احمقانہ مشورہ تم مجھے نہ ہی دو تو بہتر ہے۔'' ''ارے تم کیوں اتنا بدک رہی ہو، یہ تو ایک کھیل ہے کوئی سچ مچ پریم پتر تھوڑے ہی ہے۔''

''لیکن میں تو ہندی نہیں جانتی۔'' وہ فوراً ہی نارمل ہوگئی۔ ''ہندی تمہیں میں سکھادوں گی۔ ویسے تم اپنی زبان میں بھی لکھ سکتی ہو۔

پھر وہ کامنی سے ہندی پڑھنا لکھنا سیکھنے لگی۔ قربت زیادہ ہوئی تو وہ بھی اس کے رنگ میں رنگنے لگی۔ اس نے بھی لو لیٹر لکھنا شروع کردیا۔

گرچہ یہ فعل صحیح نہ تھا، لیکن کامنی ہوشیار تھی لیٹر لکھتی اور پھاڑ کر پھینک دیتی لیکن اس نے تو بے وقوفی کی انتہا کردی تھی۔ خط لکھتی اور بغیر ٹکڑے کئے ہوئے ڈسٹ بین میں ڈال دیتی اور پھر وہ کوڑے کے ڈھیر پر پہنچ جاتا۔ آس پاس ہی میں کوئی لاخیرہ لڑکا رہتا تھا جو سارا دن یوں ہی آوارہ پھرا کرتا تھا۔

اس نے سارے ٹکڑے اکٹھے کیے اور اسے لے کر ابا کے پاس پہنچ گیا۔ ''دیکھئے یہ خط آپ کی بیٹی نے مجھے بھیجا ہے۔''

ابا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ سیدھے سادے شریف انسان تھے ایک دم چکرا گئے پھر سارے پرزے لے کر اس کے پاس آئے۔

''یہ کیا ہے؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اور اس غیر متوقع سانحہ سے اس کا چہرہ ایسا زرد ہوا کہ کاٹو تو جسم میں ایک قطرہ خون نہیں۔

''یہ تم نے لکھا ہے؟'' ابا نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔ ''جی اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کسے اور کیوں لکھا ہے؟'' ابا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ''وہ تو میں کتاب دیکھ کر لکھنے کی مشق کر رہی تھی۔'' اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ''کہاں ہے وہ کتاب؟ ابا کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اب تو وہ چکرا ہی گئی لیکن فوراً اس نے معاملہ سنبھال لیا۔

''وہ کتاب تو شمسہ باجی کی تھی وہ اپنے ساتھ لے گئیں۔'' یہ دوسرا جھوٹ تھا۔

ابا نے کاغذ اٹھایا اور باہر نکل گئے۔ اس لڑکے کی طرف کڑی نظروں سے دیکھا اور اسے مخاطب کیا۔ ''تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو! تمہاری آوارہ گردی کے قصے میں نے بہت سنے ہیں، ابھی فوراً یہاں سے نکل جاؤ اور اب کبھی جو ادھر کا رخ کیا تو تمہاری ٹانگیں تڑوادوں گا۔'' انہوں نے خط پھاڑ کر اس کے منہ پر دے مارا۔

وہ لڑکا سر جھکائے آہستگی سے نکل گیا۔ اور تب اس نے اطمینان کی سانس لی، وہ پل صراط سے صحیح و سالم گزر گئی ورنہ اس ذرا سی غلطی کے لئے اسے نہ جانے کتنے خمیازے بھگتنے پڑتے۔

یہ پندرہ سولہ سال کی عمر ہی بہت خطرناک ہوتی ہے۔ اس عمر میں بہت ساری حماقتیں اور لغزشیں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اچھی صحبت اختیار کرو۔ اس وقت اسے دادی اماں کا کہا ہوا ایک محاورہ یاد آ گیا جو اکثر اسے ڈانٹتے ہوئے کہا کرتی تھیں۔

''اچھے سنگ بیٹھو گے، کھاؤ گے بیڑا پان۔ برے سنگ بیٹھو گے کٹاؤ گے دونوں کان۔''

اللہ کا شکر تھا اس کے دونوں کان سلامت تھے۔ اس نے کان پکڑ کر توبہ کی کہ اب کبھی ایسی حماقت نہ کرے گی ویسے کامنی کوئی بری لڑکی نہ تھی۔ غلطی سراسر والدین کی تھی جنہوں نے اسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ خالی ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے جس میں طرح طرح کے خرافات پنپتے رہتے ہیں۔

ooo

اس کے ننھیال والوں کو پاکستان گئے ہوئے پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اس درمیان ان لوگوں کا کچھ حال چال معلوم نہ ہوسکا تھا۔ اگر نانی اماں زندہ ہوتیں تو اول تو وہ پاکستان جاتی ہی نہیں اور اگر بالفرض چلی بھی جاتی تو اسے اپنے دل سے یوں نہ نکال باہر کرتیں۔ خالہ اماں وغیرہ پر تو یہی محاورہ صادق آتا ہے کہ نظروں سے دور تو دل سے بھی دور۔ وہ ان لوگوں کو یاد کر کے اکثر اداس ہوجاتی۔ پھر اچانک ایک دن ابا نے ایک خط اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''لو یہ تمہاری خالہ اماں نے بھیجا ہے'' وہ خط تیزی سے پڑھنے لگی۔ انہوں نے لکھا تھا ''میں اپنی زمین اور جائداد کے سلسلے میں ان دنوں ہندوستان

آئی ہوئی ہوں۔ میں تم سے ملنے ضرور آتی لیکن یہاں اتنا کام اتنا جھمیلا ہے کہ میں آنے سے مجبور ہوں۔ تم ہی آنے کی کوشش کرو اور ضرور آؤ تم سے ملنے کے لئے دل تڑپ رہا ہے اور دیکھنے کے لئے آنکھیں پھڑک رہی ہیں۔ شمیمہ تو اپنے شوہر کے ساتھ ہے لیکن نشو میرے ساتھ آئی ہے وہ بھی تم سے ملنے کے لئے بے چین ہے۔ خط پڑھ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور چھوٹی آپا کا نام سنتے ہی ان کے ساتھ جڑی ہوئی بہت ساری یادیں تازہ ہوگئیں۔

خالہ اماں کا نیم پختہ مکان، بہت بڑا صحن جس میں بیلی چمبیلی، موگرا اور مہندی کے جھاڑ لگے تھے۔ آم امرود، لیموں کلوندا کے بھی چند پیڑ تھے۔ بیچ صحن میں ایک چوبی تخت بچھا رہتا تھا۔ ننھے ماموں وہاں اکثر آتے اور اپنے رومال سے تخت کی گرد جھاڑ کر بیٹھ جاتے حالانکہ وہ بہت نفیس شخصیت کے مالک تھے۔ ہمیشہ بے شکن سفید پوشاک پہنے رہتے تھے لیکن اس تخت پر بیٹھنے میں ذرہ بھی عار نہ تھا۔ وہ گھنٹوں اس تخت پر بیٹھے رہتے۔

وہ باتیں تو اور لوگوں سے کرتے رہتے لیکن ان کی نظریں چھوٹی آپا پر ٹکی رہتیں۔ چھوٹی آپا جب دیر تک خود کو ان کی نظروں کے حصار میں پاتیں تو شرما کر ایک جھٹکے سے اٹھ جاتیں۔ تب ان کی دراز ریشمی زلفیں ان کے شانے پر لہرا جاتیں تب وہ اور بھی غضب ڈھاتیں۔

خدا نے انہیں دل کھول کر حسن عطا کیا تھا اور شاید ان کے حسن نے ہی ننھے ماموں کو اپنا گرویدہ بنا ڈالا تھا۔

چند دنوں بعد ہی ابا نے اسے خالہ اماں کے یہاں پہنچا دیا وہاں سبھوں نے اسے خوب لپٹا لپٹا کر پیار کیا۔ چھوٹی آپا بہت خوش ہوئیں۔ لیکن انہیں دیکھ کر وہ سکتہ میں آگئی۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھیں، چہرہ مرجھائے ہوئے زرد گلاب

کے مانند ہوگیا تھا۔

کچھ دیر وہ انہیں ایک ٹک دیکھتی رہی پھر ان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''آپ نے اپنا یہ کیا حال بنا لیا چھوٹی آپا، کس غم نے کس کی جدائی نے آپ کو اس حال میں پہنچا دیا ہے؟''

کچھ دیر تک وہ خاموش رہیں پھر ایک آہ بھر کر بولیں۔''سب سے بڑا غم تو اپنے شہر بدر ہونے کا ہے۔ جب میں اپنی دہلیز پار کر رہی تھی تو میرے سینے میں ایک درد سا اٹھا تھا۔ میں پلٹ پلٹ ان پیڑ پودوں، کھیت کھلیانوں اور ندی نالوں کو دیکھ رہی تھی، جو پیچھے چھوٹتے جا رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میری ساری متاع حیات یہیں چھوٹ گئی ہے صرف ان کی یادیں میرے شامل ہیں۔ جب میں وہاں پہنچی تو اس اجنبی شہر، انجانے ماحول اور نامانوس فضا میں میرا دم گھٹتا، مجھے تو اپنی وہی تنگ و تاریک گلیاں یاد آتیں۔ ایسا لگتا جیسے میرے صحن کے پیڑ پودے مجھے آواز دے رہے ہیں، درختوں میں لگے پھل پھول مجھے بلا رہے ہیں۔ وہ چوبی تخت میرا انتظار کر رہا ہے۔''اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئیں لیکن ان کی آنکھوں سے متواتر آنسو گر رہے تھے۔ اس نے کچھ دیر تک ان کے نارمل ہونے کا انتظار کیا پھر پوچھا۔''اور ننھے ماموں کبھی یاد آتے ہیں کہ نہیں جن کی محبت کی کونپلیں آپ کے دل کے آنگن میں پھوٹ چکی تھیں۔ اس سوال پر وہ کچھ نروس ہوگئیں پھر کہا۔''میرے خیال میں اس چیپٹر کو یہیں پر کلوز کر دینا چاہئے دبی ہوئی چنگاریوں کو کریدنے سے کیا فائدہ۔''

اور واقعی جب تک وہ ان کے ساتھ رہی انہوں نے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔

ooo

ایک دن شام کو جب ابا آفس سے آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ انہوں نے لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''لو شاید یہ تمہاری کسی سہیلی کا خط ہے۔''

اس نے جھٹ لفافہ ان کے ہاتھ سے لیا اور کمرے میں چلی گئی۔ لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ نادیہ کا خط تھا۔

اس نے جیسے ہی لفافہ کھولا، ایک تصویر بھد سے اس کی گود میں گری۔ وہ چونکی لیکن زیادہ توجہ نہ دی اُسے تو خط پڑھنے کی جلدی تھی۔

پیاری نوشین!

امید ہے بخیر ہوگی اور زندگی کا لطف اٹھارہی ہوگی لیکن میں یہاں تمہارے بغیر بہت اداس ہوگئی ہوں بھلے تم میری نظروں سے دور ہو لیکن دل سے دور نہیں۔ تمہاریادیں اکثر تڑپاتی رہتی ہیں۔ نزدیک تھی تو کبھی کبھی کسی موقع پر ہمارا ساتھ ہوجایا کرتا تھا۔ اب وہ بھی عنقا ہوگیا۔ جی چاہتا ہے ہر وقت تمہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھوں۔ میری پیاری بہن! کیا تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے گھر آسکتی ہو۔ میری بھابھی بننا تمہیں منظور ہے؟ میرے بھیا تمہیں پسند ہیں؟ ان کی تصویر بھیج رہی ہوں دیکھ کر اپنا فیصلہ سنانا۔

تمہاری نادیہ

اس سے آگے وہ کچھ نہ پڑھ سکی اور تصویر اٹھا کر دیکھنے لگی۔''تو یہ چوہا سا بندہ اتنا ہینڈسم ہوگیا ہے۔ پھر تصویر بھی لفافے میں ڈال کر بکس میں بند کردیا، مبادہ کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔

پھر بچپن کی بھولی بسری یادیں ذہن کے پردے پر فلم کی طرح چلنے لگیں۔

جب بھی وہ نادیہ کے یہاں جاتی، یہ بندہ الہ الدین کے چراغ کے جن کی طرح آموجود ہوتا۔ حالانکہ وہ پڑھائی کے سلسلے میں گاؤں سے باہر رہتا تھا۔ لیکن جیسے اسے مہک لگ جاتی تھی۔ آتے ہی نت نئی شرارتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر انہیں ستاتا رہتا۔ ایک دن اس کی سب سے پیاری گڑیا غائب ہوگئی۔ وہ دونوں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئیں۔ تب ہی وہ مسکراتا ہوا وہاں پہنچا۔ ''کیا کھوج رہی ہو نادیہ! کچھ ہوگیا ہے؟''

''میری گڑیا کہاں گئی؟ ضرور تم ہی نے چھپائی ہے بھیا؟'' وہ روہانسی سی ہوگئی۔ ''اوہ وہ گڑیا؟ وہ تو بہت گندی ہوگئی تھی، میں نے صاف ہونے کے لئے ٹب میں ڈال دیا ہے۔'' وہ دوڑ کر ٹب سے گڑیا نکال لائی۔ لیکن گڑیا بیچاری تو چیتھڑی ہوچکی تھی۔ ''یہ کیا کیا تم نے بھیا؟ ٹھہرو میں ابا سے شکایت کرتی ہوں۔

''نا بہنا نا! میں تمہارے لئے اس سے اچھی گڑیا لادوں گا اسے بہلاتا ہوا وہ دھیرے سے چل دیا۔

اس کی اس حرکت پر نادیہ سے زیادہ اسے غصہ آرہا تھا۔ ''ہونہہ، گڑیا گندی ہوگئی تھی۔ اپنا چہرہ دیکھا ہے؟'' کالا بھجنگا جیسے نو من میل بدن پر چمٹا ہو۔'' وہ جلے دل کا پھپھولا پھوڑ رہی تھی۔

روز روز کی شرارت سے تنگ آکر ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ اب ایسے کام نہیں چلے گا۔ ابا سے شکایت ضرور کرنی ہوگی۔ موقع دیکھتے ہی ان دونوں نے اسے دھمکانا شروع کیا۔ ''بھیا اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ ابا سے شکایت کر کے تمہیں مار نہ کھلوایا تو میرا نام بدل دینا۔''

اور میں نے بھی تم دونوں کی ٹانگیں نہ تڑوادی تو میرا نام ندیم نہیں ابا

سے کہوں گا۔ یہ دونوں دوڑ دوڑ کر مودی کی دوکان جاتی ہیں؟''

اس دھمکی سے وہ دونوں سٹپٹا گئیں۔ پھر کسی طرح صلح صفائی ہوئی یہاں آنے سے پہلے وہ ایک بار نادیہ سے ملنے گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ وہاں موجود تھا۔ اب وہ لوگ باشعور ہو چکے تھے۔ اس کے دل میں اس بندہ کے لئے کوئی لگاوٹ کے جذبے نہ تھے۔ البتہ شوخیاں کرتا ہوا وہ اسے بہت اچھا لگتا۔

اس رات وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہی تھی۔ عشق محبت جیسا کوئی جذبہ تو نہ تھا لیکن یہ ایک ایسا حسین خواب تھا جس میں آرزوؤں ارمانوں کا رنگ گھلا تھا، جن میں مستقبل کے تانے بانے بنے تھے۔ صحیح معنوں میں آج اس نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ سارے خوابیدہ جذبے بیدار ہو رہے تھے۔

ooo

کچھ ہی دنوں بعد نادیہ کے بھائی ندیم کا پروپوزل اس کے لئے آ گیا۔ ابا کو تو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن دادی اماں نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ وجہ یہ تھی کہ کچھ دن قبل وہ کسی موذی مرض کے شکار ہوئے تھے، لہٰذا یہاں رشتہ نامنظور کرنے کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔ اور اوپر خدا ہنس رہا تھا اپنے بندوں کی نادانی اور لاعلمی پر اب کچھ دنوں بعد دادی اماں ابا کو یہ احساس دلاتیں کہ بیٹی جوان ہوگئی ہے رشتہ تلاش کرو کہ بیٹی جوان ہوگئی ہے لیکن وہ انہیں ٹال دیتے تھے کیونکہ وہ کمسنی کی شادی کے حق میں نہ تھے لیکن جلد ہی دادی اماں کی مراد پوری ہوگئی۔

ایک دن اچانک اس کے لئے رشتہ آ گیا۔ ابا ٹالتے رہے کیونکہ انجان

فیملی میں رشتہ کرنے کے حق میں بھی وہ نہ تھے لیکن لڑکے والوں نے اس قدر سبز باغ دکھایا کہ آخر یہ رشتہ طئے پا ہی گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسکے حق میں یہ اچھا ہورہا ہے یا برا؟ دل میں کوئی ہلچل نہ تھی، نہ اچھا نہ برا نہ کوئی جذبہ خوشی کا نہ غم کا بس اس کے نام کے ساتھ ایک نام جوڑ دیا گیا تھااور اس نام کی وہ ملکیت بن گئی تھی۔ یہ کیسا بندھن تھا نہ جانا نہ بوجھا، نہ دیکھا نہ بھالا، نہ محبت نہ نفرت۔ بس دل میں ایک بے سکونی تھی۔

کبھی کبھی نادیہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی۔ ''تم بہت خوش نصیب ہونوشیں! اتنا ڈیسنٹ بندہ تم پر فدا ہے۔ اگر تم نے اس کے جذبے کی پذیرائی نہ کی تو پچھتاؤ گی۔ تمہارے ذکر پر وہ ایسا کھل جاتا ہے جیسے سارے جہاں کی دولت اسے مل گئی ہو۔'' ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

ooo

اس کے عقد کو دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اس طرف سے کوئی کھوج خبر نہ تھی۔ نہ خط کتابت، نہ آنا جانا، نہ عیدی بقرعیدی۔ عقد کرکے وہ لوگ سکھ کی نیند سو چکے تھے نہ جانے انہیں کیا مجبوری تھی۔ اور ابا پریشان تھے لیکن کسی لڑکی کے باپ کے لئے بار بار رخصتی کا تقاضہ کرنا ہتک آمیز بات ہوتی ہے پھر بھی رسم دنیا تو نبھانی ہی پڑتی ہے۔ ویسے کوئی لڑکی اپنے والدین پر بوجھ نہیں ہوتی یہی سوچتے سوچتے ایک سال اور گزر گیا اور اسی دوران ابا کا ٹرانسفر کہیں اور ہوگیا۔ اب تو لوگوں نے وجہ پوچھنی شروع کردی تھی۔ یہ بات ابا کے

لئے اور تکلیف دہ ہوتی جارہی تھی۔

کسی طرح عقد کے پورے چار سال بعد رخصتی کی تاریخ مقرر ہو پائی۔ اب گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں چونکہ دونوں بھائیوں کے بیچ وہی سب سے بڑی لڑکی تھی لہٰذا سب کے دلوں میں جوش و خروش تھا۔ امی ابا شادی کے انتظام میں جٹے تھے۔

جب رخصتی کا دن قریب آیا تو گھر مہمان سے بھر گیا۔ باراتیوں کے ٹھہرنے کے لئے ڈاک بنگلہ سجایا گیا۔ گھر میں بھی برقی قمقموں کی لڑیاں لٹکائی گئیں۔ نادیہ بھی آئی اس بیچ اس کی شادی ہوچکی تھی اپنی تمنا نہ پوراہونے کا اسے بہت افسوس تھا لیکن اس نے اپنی ناراضگی کا زیادہ اظہار نہ کیا اور دلہے سے ہنسی مذاق کرتی رہی۔

دوسرے دن ہر لڑکی کی طرح وہ بھی رخصت ہوگئی۔ اس وقت وہ دو متضاد کیفیت سے دوچار تھی۔ ایک طرف میکہ چھوٹنے کا افسوس تھا تو دوسری طرف نئی زندگی میں قدم رکھنے کا خوشگوار احساس، انہی خیالوں میں گم جب اس نے سسرال کی دہلیز پر قدم رکھا اور گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھا تو چکرا گئی۔ دھڑا دھڑ اس کے سپنوں کا محل مسمار ہوگیا۔ اپنے دل کے نہاں خانے میں جو ایک بت اس نے بیٹھایا تھا وہ پاش پاش ہوگیا اور وہ اس کے ملبے کے نیچے دب کررہ گئی۔ وہ جذبات کی شدید توڑ پھوڑ میں تھی۔ بڑی مشکل سے وہ اپنی اس کیفیت سے باہر آئی۔ دل میں ذرا ٹھہراؤ آیا تو اس نے سوچا۔ ''وہ یہ کیوں بھول گئی کہ کاتب تقدیر جو کچھ انسان کی تقدیر میں لکھ دیتا ہے، اسے کوئی نہیں بدل سکتا ہے۔ اور پھر اس نے خدا کے اس فیصلے کو قبول کرلیا۔ جب وہ حجلۂ عروسی میں پہنچی تو اس کا دل زور زور دھڑک رہا تھا اور یہ دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ اب

کوئی پھڑکتا ہوا جملہ یا مصرعہ اس کی سماعتوں سے گزر کر اس کے دل کو چھونے لگا۔ لیکن نہ تو اس کی خوبصورتی پر کوئی قصیدہ پڑھا گیا نہ ہی محبت کا یقین دلایا گیا۔ وہ سوچتی رہ گئی کہ کیا یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جس کا تصور ہر لڑکی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی کرنے لگتی ہے اور پھر یہ لمحے اتنے جاوداں ہوتے ہیں کہ زندگی بھر دل میں روشن رہتے ہیں۔ لیکن شاید وہ جذبوں کی ان لطافتوں کو زندگی بھر ڈھونڈتی رہ جائے گی۔

ooo

پھر وہ میکے آ گئی اور اب پھر وہی شب و روز وہی تنہائی تھی۔ اس کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی شادی کو ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران صرف دو بار اس کے شوہر اس سے ملنے آئے تھے۔

جب تک لڑکی کی شادی نہیں ہوتی ہے، میکہ ہی اس کا گھر ہوتا ہے لیکن شادی کے بعد اگر لڑکی زیادہ دن میکہ میں رہ جاتی ہے تو ہر طرف سے انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔

اس کے پاس پڑوس والیاں بھی اسے عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتیں۔ ”یہ ابھی تک یہیں ہے سسرال نہیں گئی۔“ اور وہ شرمندہ ہوکر وہاں سے کھسک جاتی۔

اپنی شادی شدہ زندگی کے اس ایک سال میں، اس نے کوئی انجوائے نہیں کیا۔ نہ کہیں سیر کے لئے گئی نہ کسی شادی نہ کسی فنکشن میں شریک ہوسکی۔

ان دنوں جہاں ابا کی پوسٹنگ تھی وہ ایک تاریخی مقام تھا۔ تاریخی

عمارتوں کے علاوہ وہاں پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو خود رو سر سبز و شاداب پیڑ پودوں سے ڈھکا تھا۔ یہ منظر بڑا ہی سہانا تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ جس کی خوبصورتی اور پھولوں کی مہک دل میں ایک خوشگوار فرحت کا احساس جگادیتی۔ پہاڑ کی تہ سے پھوٹتے ہوئے چشمے ماحول میں ایک عجیب سا حسن پیدا کردیتے۔ آنے والے دور دور سے آتے اور قدرت کی اس صنعت کاری پر داد تحسین دیتے۔ پہاڑ کے دامن میں سلسلے سے غریبوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ وہ لوگ مویشی پالتے اور پہاڑ پر اگے پیڑ پودوں اور گھاس پھوس سے مویشیوں کے لئے چارہ اکٹھا کرتے۔

وہاں کے باشندوں کے لئے یہ ایک بہترین سیر گاہ تھی۔ برسات کے موسم میں اکثر لوگ وہاں پکنک منانے جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں شاید باید ہی کسی کے پاس گاڑی وغیرہ ہوتی تھی۔ لوگ تانگے پر ہی سفر اور انجوائے کرتے۔ اکثر لوگ وہاں پیڑوں پر جھولا بھی ڈالتے تھے۔ اسٹوو لے کر جاتے، پکوڑی بھی چھانتے چائے بھی بنتی تھی۔

اکثر وہ بھی امی کے ساتھ وہاں پکنک منانے جاتی، خوب مزہ آتا لیکن اب وہ پہلے کی طرح انجوائے نہیں کر پاتی۔ کبھی کسی جوڑے کو اٹکھیلیاں کرتے دیکھتی تو تمنائیں جاگ جاتیں۔ جب پانی کی موتیوں بھری لہریں اس کے پاؤں کو چھوتیں اور وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتی ایسے میں اسے ایسا لگتا کہ کوئی ہاتھ بڑھ کر اسے تھام لے۔

صنف نازک کو زندگی کے ہر موڑ پر کسی کی رفاقت درکار ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے سب سے خوبصورت اور دلپسند رفاقت مرد کی ذات ہوتی ہے۔

ooo

سارا دن تو چلتی رہی تھی۔شدید گرمی تھی۔ پہاڑی علاقہ میں ویسے بھی گرمی زیادہ پڑتی ہے۔ لیکن رات ہوتے ہی ہوا کا رخ بدل جاتا ہے۔ وہ کھلی چھت پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ایسی بے خبر سوئی کہ صبح ہی اس کی آنکھ کھلی۔ ابھی وہ نماز سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ ابھی سب لوگ غافل پڑے تھے لہٰذا اسے ہی دروازہ کھولنا پڑا۔ سامنے شوہر نامدار کھڑے تھے۔ ''خیریت؟'' اس نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ ''ہاں خیریت ہی ہے''، ''یہ اتنا سویرے سویرے تشریف آوری کیسے ہوئی؟''، ''سب کچھ یہیں پر پوچھ لوگی یا راستہ بھی چھوڑوگی؟''، ''لیجئے راستہ چھوڑ دیا۔'' اس نے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں لے جانے کے لئے آیا ہوں۔ میرے خالہ زاد بھائی کی شادی ہے۔ پروگرام اچانک بنا اس لئے پہلے سے خبر نہ کرسکا۔ کل ہی جانا ہے، سامان آج ہی درست کر لینا۔''

ناشتہ سے فراغت کے بعد انہوں نے یہ خبر سنائی۔ ''کیا اس افراتفری میں رخصتی کے لئے ابا تیار ہوجائیں گے؟''، ''انہیں اعتراض ہوسکتا ہے۔ کچھ طول طویل تو کرنی ہے نہیں۔''

بہر حال وہ بہت خوش تھی۔ چلو کچھ تبدیلی تو آئے گی شادی میں ملے ہوئے یہ زیور یہ کپڑے لتے کام آئینگے۔ دوسرے روز وہ روانہ ہوگئی۔

وہاں اور لوگ جمع تھے۔ سبھوں سے مل کر اسے اچھا لگا۔ جب شادی کا ہنگامہ ختم ہوا۔ سارے مہمان چلے گئے۔ شوہر بھی اپنے جاب پر چلے گئے اور وہ تنہا رہ گئی تو اسے بہت بوریت ہونے لگی۔

اور پھر جب اسے بہت ساری باتوں کا علم ہوا، وہاں کے طور طریقے

معلوم ہوئے تو اس کے ہوش اڑ گئے۔

یہاں کے ماحول اور اس ماحول سے جہاں وہ پلی، بڑھی تھی، بہت فرق تھا۔ یہاں بڑی بندشیں تھیں، بڑی پابندیاں تھیں اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے وہ خود کو اس ماحول میں ڈھالے گی۔ خود کو یہاں سٹ کر پائے گی۔

کسی طرح اس نے وہاں ایک ماہ گزارا پھر واپس آ گئی۔

OOO

کئی دنوں سے وہ عجیب عجیب خواب دیکھ رہی تھی اس خواب کا اثر اس کے ذہن پر اتنا حاوی ہوتا کہ وہ سارا دن بولائی بولائی پھرتی کہ اچانک ایک شام جب ابا آفس سے آئے تو انہوں نے یہ روح فرسا خبر سنائی۔ ''وقار کی طبیعت خراب ہے وہ ہاسپٹلائزڈ ہیں۔ کل جانا ہے۔ ہلکا پھلکا سامان تیار کر لینا۔

اس خبر نے تو جیسے اس کے جسم کی ساری انرجی کھینچ لی۔ کسی طرح تیار ہوکر وہ ابا کے ساتھ چل دی۔

وقار کو دیکھ کر اس کے حواس ہی اڑ گئے۔ وہ بڈ پر چت لیٹے تھے۔ آکسیجن لگا ہوا تھا۔ انہیں ہارٹ اٹیک آیا تھا۔ ''اللہ خیر کرے'' بس اتنا ہی اس کی زبان سے نکلا۔ دو دنوں تک یہی حال رہا۔ وہ خدمت تو کیا کرتی، ہاں دعا کرتی رہی لیکن شاید قبولیت کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ تیسری شام قصہ ختم ہوگیا۔ اسے تو کچھ ہوش نہ تھا لیکن اتنا یاد ہے کہ ابا اسے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اور دوسرے دن وہ لٹی پٹی واپس آ گئی۔

گھر میں کہرام مچ گیا۔ اتنے بڑے حادثے پر ہر کوئی اداس تھا، سب کی آنکھیں نم تھیں۔ اور وہ تو ایک مورتی بن کر رہ گئی تھی۔ لوگ آتے اس کی

حالتِ زار پر افسوس کرتے تسلی کے چند بول بولتے اور چلے جاتے۔

وہ اپنی ازدواجی زندگی سے ابھی تھوڑی خوشیاں بھی کشید نہ کر پائی تھی کہ اس پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ قیامتیں جب ٹوٹ پڑتی ہیں تو انسان کا ذہن، دل و دماغ اور ساری شخصیت تہس نہس ہوجاتی ہے۔ اس اذیت سے انسان کی سوچنے سمجھنے کی طاقت بھی سلب ہوجاتی ہے۔

دن تو کسی صورت گزر جاتا لیکن رات کسی عذاب سے کم نہ ہوتی۔ رات کے کئی پہر گزر جاتے، ہر ذی روح نیند کی آغوش میں پہنچ کر سارے فکر و غم سے آزاد ہوجاتا لیکن اس کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی ہوتی اور وہ فکر و تردد کی وادیوں میں بھٹکتی رہتی آنکھیں آبشار بن جاتیں جو ساری رات متواتر بہتی رہتیں اپنی زندگی کے گزرے ہوئے ان چند سالوں کے واقعات جب وہ یاد کرتی تو سوچتی کہ وہ کیا سے کیا بن گئی۔

یوں تو وہ ایک ادنیٰ سی لڑکی تھی لیکن اکثر لوگ اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے جس نے اس کی شخصیت کو اتنا نمایاں کردیا تھا کہ وہ خود کو بہت ہی اہم سمجھنے لگی تھی۔ اور اپنے مستقبل کے حوالے سے بہت خوبصورت، بہت ہی دلکش خواب دیکھنے لگی تھی۔

وہ کیا جانتی تھی کہ اس کی زندگی میں یہ دور بھی آئے گا۔ اس کی اڑان تو بہت اونچی تھی۔ تخیل کی پرواز بہت بلند تھی۔ کبھی وہ چاند ستاروں کو چھونے کی کوشش کرتی، کبھی بادلوں کے دوش پر محوِ رقص رہتی۔ جاگتی آنکھوں سے سہانے خواب دیکھتی۔ ہزار محرومیوں کے باوجود خود پر زیادہ دنوں تک یاسیت طاری ہونے نہ دیتی۔ حساس ضرور تھی لیکن کسی ناگوار واقعہ کا اثر زیادہ دیر تک نہ لیتی۔ بہت ہی صاف دل اور صاف گو تھی۔ یہ وصف اسے ابا کی طرف سے ورثے میں

ملا تھا۔ اس کی ان ہی خوبیوں کی بنا پر بہت سارے ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

کوئی شیدائی تھا، کوئی طلب گار اور کوئی عقیدت مند لیکن جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں۔اسے کون بدل سکتا ہے۔ سچ پوچھو تو کوئی قصور وار نہ تھا یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ اور وہ بغیر قصور کے سزا بھگت رہی تھی اور اب یہی سب اسے زندگی بھر سہنا ہے۔ بے خواب طویل راتوں میں تنہائی کا عذاب جھیلنا ہے۔

نہ جانے کس کس کا دست نگر بننا ہے، کس کس کے سامنے ہاتھ پھیلانا ہے۔ اور نہ جانے اس طرح کے کتنے خیالات دل و دماغ میں جنم لیتے اور آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے۔

ایک دن وہ یونہی اداس بیٹھی تھی کہ کسی نے ایک خط اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ یہ نادیہ کا خط تھا۔

پیاری نوشین تمہیں خوش رہنے کا حوصلہ کیسے دوں۔ یہ اچانک کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟

یہ روح فرسا خبر سن کر تو میرے ہوش، حواس اڑ گئے۔ تمہیں خط لکھنے کی ہمت ہی نہیں جٹا پا رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے تمہیں تسلی دوں کیسے تمہارے زخم پر پھاہا رکھوں۔

اس روز ساری رات میں سو نہ سکی۔ جیسے ہی سونے کی کوشش کرتی، تمہارا مرجھایا ہوا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ اتنے بڑے حادثے کو تم کیسے سہہ سکو گی، یہی سوچ کر دل بیچین تھا۔

بہر کیف اب صبر کرنے کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے۔ پیاری نوشین اب صبر کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے۔ پیاری بہن اس غم میں ڈوب کر تم خود کو ہلاک نہ کر لینا۔ تمہاری زندگی ہم لوگوں کے لئے بہت ہی اہم ہے۔

میں بہت ہی جلدی تمہارے پاس آنے کی کوشش کروں گی، گرچہ یہ تمہارے غم کا مداوا تو نہ ہوگا پھر بھی۔

خط اس کی مٹھی میں دبا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ نادیہ! کتنی آسانی سے تم نے مجھے صبر کرنے کی تلقین کردی۔ ذرا میرے دل کے اندر جھانک کر دیکھنے کی تو کوشش کی ہوتی وہ دل ہی دل نادیہ سے مخاطب تھی، تبھی کسی نے آکر کہا۔ ''تمہارے سسر اور دیور آئے ہیں۔''

ان کا سامنا کرنے کی تو اس میں ہمت نہ تھی پھر بھی وہ ان کے پاس جانے کے لئے اٹھ گئی۔

سلام کرکے چپ چاپ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اور سسر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

''یہ غم صرف تمہارا ہی نہیں ہے بیٹی! ہم سب کا ہے۔ مجھے دیکھو میں نے دل پر پتھر رکھ لیا ہے۔ اب تمہیں ہی دیکھ کر اس غم کو بھلانا ہے۔ اب تم بہو نہیں میری بیٹی بن کر میرے پاس رہوگی۔ تمہیں تمہارا پورا پورا حق میں دوں گا۔ پھر بہت دیر تک وہ ابا سے گفتگو کرتے رہے۔ اپنی جائداد میں اس کا حصہ دینے کا وعدہ کیا۔

ابا سیدھے سادے انسان تھے ان کی باتوں پر یقین کرلیا اور عدت کے بعد وہاں بھیج دیا۔ لیکن وہاں اس موضوع پر صرف تبصرہ ہی ہوتا رہا۔ عملی طور پر ایسا کچھ نہ ہوا اور وہ ناکام واپس آگئی۔

ooo

اس کے بزرگ اس کی آئندہ زندگی کے لئے بہت فکر مند تھے لیکن اس کا کوئی حل نکالنے سے قاصر تھے۔

اور اس کی سمجھ میں کچھ آ ہی نہیں رہا تھا کہ اپنی باقی زندگی وہ کس طرح گزارے گی۔ بہت ہی سوچ بچار کے بعد ایک بار پھر اس نے سسرال جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے تھوڑی بہت امید تھی کہ شاید وہ لوگ اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ غور وفکر کریں۔ لیکن وہاں جاکر، ان لوگوں کے خیالات جان کر اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ لوگ اپنی جائداد کا تھوڑا حصہ بھی ادھر اُدھر کرنا نہیں چاہتے اس معاملہ میں وہ لوگ بہت ہی سخت ہیں۔ اسے صرف بہلاوے پر رکھ رہے ہیں اور اگر وہ وہاں مستقل طور سے رہ گئی تو اس کی حیثیت کیا رہ جائے گی۔ یہ سوچ کر ہی وہ لرز گئی۔ اور بہت ہی دل برداشتہ ہوکر وہاں سے لوٹ آئی۔

اس کے غائبانہ میں ہی نادیہ کا خط آیا پڑا تھا ادھر کچھ دنوں سے وہ اس طرح فکر دنیا میں سرگرداں تھی کہ اسے بالکل ہی بھول بیٹھی تھی۔ خط اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا اور نظریں اس کی تحریر پر تھیں۔

پیاری نوشین بہت سارا پیار!

امید ہے کہ تم بخیر ہوگی۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ وطن چھوڑتے وقت تم سے نہ مل سکی۔ کیا بتاؤں، پروگرام اتنا آناً فاناً بنا کہ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ جب مجھے خبر ملی کہ مجھے جلد ہی لندن جانا ہے، اس کے صرف ایک ہفتہ بعد ہی مجھے انڈیا چھوڑ دینا پڑا۔

کامل کے ایک دوست کی فیملی جارہی تھی اسی کے ساتھ میرا بھی ٹکٹ

تھا۔ یہاں پہنچ تو گئی لیکن ذہنی طور پر ابھی میں وہیں ہوں۔ دھیرے دھیرے خود کو اس ماحول کا عادی بنانا پڑے گا۔ جب یہ سوچتی ہوں کہ وطن چھوٹا، عزیز اقربا چھوٹے،، ددوست احباب چھوٹے تو دل کی عجیب کیفیت ہوجاتی ہے اور اب تو اس جدائی کو سہنا بھی ہے کہ ایک رشتہ سارے رشتوں پر بھاری ہے اور اسے نبھانا ہی خوش قسمتی ہے۔

سنا ہے کہ تم بار بار اپنے سسرال کے چکر لگارہی ہو۔ کیا قصہ ہے اور تمہارے کیا ارادے ہیں۔

ابھی ذرا جلدی میں ہوں بہت سارے کام پڑے ہیں۔ یہ ہندوستان تو نہیں کہ حالات بدل جانے کے باوجود دوچار نوکر چاکر آگے پیچھے لگے رہے ہیں۔ یہاں تو سارا کام خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ ہزار سہولتوں کے بعد بھی تھک جاتی ہوں۔ انشاء اللہ بعد میں تمہیں تفصیل سے خط لکھوں گی۔

جب تک کے لئے خدا حافظ۔'' خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا اور آنسو کے دو قطرے اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔ ''تم نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن تم سے اتنی سی التجا ہے۔

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے

ooo

اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اسے ہی کچھ کرنا ہے وہ اپنی کفیل خود بنے گی اور اس کے لئے علم حاصل کرنا ضروری ہوگا پھر اس نے اپنی تمامتر توجہ کتابوں پر مرکوز کردی ویسے بھی اسے پڑھنے لکھنے کا شوق شروع سے رہا تھا اور پڑھے لکھے لوگ ہمیشہ اسے متاثر کرتے رہے تھے۔ وہ اپنے ارادے پر پوری

طرح کار بند تھی۔ وقت کا زیادہ حصہ پڑھنے لکھنے میں گزارتی اور کافی حد تک پر سکون بھی ہو چکی تھی۔

اسی اثنا میں ابا کا پروموشن ہوگیا اور ٹرانسفر ایک ضلع میں ہوگیا۔ اس وقت دادی اماں بہت زیادہ علیل تھیں لہٰذا وہ ابا کے ساتھ نہ جاسکی بلکہ دادی اماں کے ساتھ بھائی کے یہاں آ گئی۔ وہاں جانے کے دو مقاصد تھے ایک تو دادی اماں کی خدمت جس کی ذمہ داری شروع سے ہی اس کے کندھوں پر تھی۔ دوسرا حصولِ تعلیم کی خواہش کیونکہ بھائی درس و تدریس کے شعبہ سے منسلک تھے۔ لیکن اس کی بدقسمتی نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ کچھ لوگوں نے اس کا جینا دشوار کر دیا تھا۔ اس کی ہر ایک بات پر اعتراض کیا جانے لگا۔ اس کا اٹھنا، بیٹھنا، ہنسنا، بولنا، چلنا پھرنا ہر چیز ہر کام قابل اعتراض گردانا جاتا۔ تب اسے ایسا لگتا جیسے خدا نے اس سے جینے کا حق ہی چھین لیا ہو اور یہ تجربہ بھی ہوا کہ بچپن میں ماں کی آغوش اور سر پر ان کا سایہ اور جوانی میں شوہر کا ساتھ، اس کا سہارا کتنا ضروری ہے ورنہ عورت بنا پتوار کی کشتی بن جاتی ہے جو لہروں کے تھپیڑے پر ڈولتی رہتی ہے۔

وہ اداس رہنے لگی اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی اتنی ہی عمر میں زندگی نے اسے ساری تلخ حقیقتوں سے روشناس کر دیا تھا۔

وہ اس ماحول سے پریشان ہوکر ابا کے یہاں چلی گئی کہ وہیں اس کی بہتر پناہ گاہ تھی۔

وہاں سے آنے کے بعد وہ بہت ہی افسردہ تھی۔ پڑھائی کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا ساری امیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ حالانکہ اب بھی اس کے دل میں پڑھنے کی چاہ تھی۔ وہی خیالات، وہی ارادے کی پختگی تھی لیکن حالات حوصلہ شکن

تھے۔ کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ نہ آگے کوئی چراغ تھا نہ پیچھے کوئی روشنی۔ زندگی میں محرومیاں زیادہ تھیں، اور امیدیں کم۔ محرومیوں کا احساس رات کی تنہائیوں میں آنکھوں سے پانی بن کر بہتا۔ وہ سوچتی اب زندگی کیسے گزرے گی۔ ابا تو خود کثیر الاولاد ہو چکے تھے۔ لیکن زندگی تو گزر ہی جاتی ہے۔ وقت خود اپنے لئے راستہ نکال لیتا ہے۔

وہ آنکھیں بند کئے یہی سب سوچ رہی تھی تبھی کسی نے جیسے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ ''بہو! بہو! ابھی تو تمہیں بہت دور جانا ہے، اتنی جلدی ہمت ہار دوگی تو اتنا طویل سفر کیسے طئے کروگی، اپنا مقصد کیسے پورا کروگی؟'' وہ ہڑبڑا کر اٹھی، کتاب قلم سنبھالا اور دل کو اسی طرف راغب کیا۔

ooo

کئی دنوں سے ابا کی طبیعت ناساز تھی۔ وہ بہت مضمحل اور کمزور ہو گئے تھے۔ اس روز جب وہ ان کی خیریت دریافت کرنے کے لئے ان کے کمرے میں گئی تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بیٹھنے کے لئے کہا۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر کہا۔ ''میرے خیال میں اب تمہیں کچھ کرنا چاہئے۔ تم اتنی اچھی سلائی بنائی جانتی ہو۔ یونہی بیکار بیٹھی رہتی ہو۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کام میں لگ جاؤ۔ دل بھی بہلا رہے گا، وقت بھی اچھا گزرے گا اور آمدنی کی صورت بھی نکل آئے گی۔''

وہ سکتہ میں آ گئی۔ ابا کے الفاظ نے اس کے دل پر تازیانہ کا کام کیا۔ اس نے زمینداری کا زمانہ تو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے خون میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے اس کے دل کو گھائل کر دیا۔ اگر یہ زمانہ ہوتا تو کچھ اور بات ہوتی،

قدم قدم پر بوٹک کھل گیا تھا۔ وہ بھی ایک بوٹک کھول کر بیٹھ جاتی لیکن اس وقت اچھے گھرانوں میں یہ کام بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔

نہ جانے ابا کے دماغ میں کس نے یہ بات اٹائی تھی اس نے سر اٹھایا اور افسردہ سی نظروں سے انہیں دیکھ کر کہا۔ ''ایسا تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں، اس کام کے لئے ذہن کو راغب کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے میں تو پڑھنا چاہتی ہوں۔'' ''جیسی تمہاری مرضی، بہر حال کچھ تو کرو۔'' وہ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ وہ انہیں یقین دلانا چاہتی تھی کہ ذریعہ معاش کے لئے درس و تدریس سے بڑھ کر اور کوئی کام بہتر نہیں ہے۔ اپنا علم دوسروں تک پہنچانا اور ہزاروں قلب کو علم کی روشنی سے منور کرنا ایک عبادت ہے۔

وہ انہیں یہ یقین تو نہ دلاسکی لیکن اس بات نے اسے بہت ہی سکون بخشا کہ انہوں نے اس کے خیالات اور ارادے سے اختلاف نہیں کیا۔

ooo

زندگی کی راہ گزر میں بہت سارے موڑ اور مرحلے آتے ہیں۔ بہت پریشانیاں مصیبتیں آتی ہیں اس کی زندگی میں بھی بہت ساری کٹھنائیاں آئیں لوگوں نے بہت سارے زخم لگائے پھر پلٹ کر بسمل کے تڑپنے کا نظارہ دیکھنے کے لئے نہ رکے۔ لیکن خدا نے انسان کو برداشت کی طاقت عطا فرمائی ہے۔ وہ بھی اپنے دل پر لگے ہوئے زخم پر پھاہا رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔

ایک بار پھر اس نے بہت ساری کتابیں اور نوٹس بک جمع کئے اور پڑھنے میں مشغول ہوگئی۔

اس مشغلہ میں وقت بہت اچھا گزر رہا تھا وہ مگن تھی محرومی کا لبادہ اس

نے بہت حد تک اتار پھینکا تھا۔ کچھ کرنے کی چاہ دل میں پیدا ہوئی تو وہ جان جی سے اس میں لگ گئی۔ اسے چھوٹے ابا کی کہی ہوئی یہ بات یاد آ گئی۔ ''جہاں تک ہو سکے علم حاصل کرو۔ یہ ایک ایسی دولت ہے جسے نہ تو کوئی چرا سکتا ہے۔ نہ ہی چھین سکتا ہے اور یہ انسان کو آسمان کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔'' چھوٹے ابا کی یاد آتے ہی ان کی شفقت اور محبت یاد آ گئی۔ کتنی شفیق ہستی تھی ان کی جو اب اس سے جدا ہو چکی تھی۔

جب بھی کبھی اسے کچھ دن ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملتا تو وہ ان سے کچھ سیکھنے، کچھ جاننے، کچھ پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔ یہ اس کے اندر جو مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، وہ انہی کی دین تھا اور اس کی شخصیت کو نکھارنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا تھا۔ پاکستان بنتے ہی ان کے سر پر وہاں جانے کی دھن سوار ہو گئی۔ وہ کتنی بار گئے آئے، آئے گئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی۔

کبھی کبھی دادی اماں ٹھنڈی آہ بھر کر کہتیں۔ ''موا یہ ملک کا بٹوارہ نہیں ہوا بلکہ انسانوں کا بٹوارہ ہو گیا ہے۔ یہ کیسی دیوار ہے جو میرے بچوں کے بیچ حائل ہے۔ یہ کیسا بٹوارہ ہے جس نے بھائی کو بھائی سے اور ماں کو بیٹے سے جدا کر دیا ہے۔''

برسہا برس گزر جانے کے بعد بھی دادی اماں اس کرب سے چھٹکارا نہیں پا سکی تھیں۔

اس زمانے میں انٹرنیٹ عام نہ تھا بلکہ شاید تھا ہی نہیں۔ ٹیلی فون اور ٹیلی گرام بھی لوگ خال خال ہی استعمال کرتے تھے ہاں ہر ماہ وہ خط لکھوانہ نہ بھولتی تھیں اور ہر بار تقریباً ایک ہی مضمون ہوتا۔

عزیز از جان بیٹے خوش رہو!

کیسے ہو؟

میری جان تو تم سب میں اٹکی رہتی ہے۔

تم یہاں سے کیا گئے، میرے دل کے دو ٹکرے ہو گئے

اب میرا حال کیا پوچھتے ہو، بس تم سب سے ملنے کی آس میں جیئے جا رہی ہوں۔

میں تمہارے پاس نہیں جا سکتی کہ ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنے دور دراز کا سفر طئے کرنے کی طاقت نہیں ہے ہو سکے تو تم لوگ ہی آنے کی کوشش کرو۔ اب میرے چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔ مرنے سے پہلے آخری بار تم لوگوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اب زیادہ جینے کی آرزو بھی نہیں کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات نے دل کو عجیب کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ سننے میں آتا ہے کہ وہاں اس سے بھی برے حالات ہیں۔ خدا تم لوگوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

ہر خط دعا سلام پر اختتام پذیر ہوتا۔

خط بھیجنے کے کچھ دنوں کے بعد ہی جواب کا انتظار شروع ہو جاتا۔ یہ سلسلہ سالوں سے چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ لڑائی چھڑ گئی۔ لیکن دادی اماں یہ پوچھنا نہ بھولتیں۔ ''بیٹا تیرے چچا کا کوئی خط وط آیا ہے؟''

''دادی اماں میں نے آپ کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ لڑائی چھڑ گئی ہے۔ اب خط و کتابت، ٹیلی فون، ٹیلی گرام سب کچھ بند ہو گیا ہے۔ بلکہ ریڈیو پر وہاں کی خبریں سننے پر روک لگا دی گئی ہے۔''

''یہ کیسا ظلم ہے؟ خود لڑیں بھڑیں لیکن یہ اپنے پرائے کی خیر خیریت

سننے پر کیوں روک لگادی ہے؟''

''یہی قانون ہے دادی اماں۔''''بھاڑ میں جائے یہ قانون۔'' پھر قدرے وقفے کے بعد پوچھتیں''یہ لڑائی کتنے دنوں تک چلے گی بیٹی؟'' ان کی آواز کرب میں ڈوبی ہوئی ہوتی۔

''لڑائی کی کوئی انتہا ہے دادی اماں، یہ تو چلتی ہی رہے گی، جب جب کوئی مسئلہ کھڑا ہوگا۔

''اف،اب یہ ملک کتنے حصوں میں تقسیم ہوگا اور ایک دل کے کتنے ٹکڑے ہوں گے؟''

ان کے چہرے پر فکر کی واضح لکیریں تھیں۔ ان کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس کے حق میں دعا کریں ان کے دل کا ایک ٹکڑا وہاں تھا تو دوسرا یہاں۔ کوئی جیتے کوئی ہارے اس سے انہیں کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ تو یہ دعا کررہی تھیں کہ راستہ کھل جائے اور بچے ان سے آملیں۔ شام ہوتے ہی وہ ہاتھوں میں تسبیح لے کر ریڈیو کے سامنے بیٹھ جاتیں، نیوز سنتیں اور نہ جانے کیا کیا دعائیں مانگتی رہتیں۔

کچھ دنوں بعد جنگ بندی کا اعلان ہوا راستہ بھی کھل گیا لیکن اس خوشی کو برتنے کے لئے وہ زندہ نہ رہیں۔ وہ دیر تک چھوٹے ابا اور دادی اماں کی یادوں میں ڈوبی رہی جو آج تک اس کے دل اور دماغ سے محو نہ ہوسکا تھا۔

ooo

آج اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ کئی دنوں سے دو آنکھیں مسلسل اس کا پیچھا کررہی ہیں۔

ایک دن جب وہ چائے لے کر ڈرائینگ روم میں گئی تو اسے اپنے چہرے پر کسی کی نظروں کی تپش محسوس ہوئی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ مرتضٰی بھائی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ ابا کے دوست کے بیٹے تھے اور ان دنوں کسی کورس کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ وہ جب بھی آتے اسی کے یہاں ٹھہرتے۔ وہ بچپن ہی سے انہیں دیکھتی آئی تھی۔ اس لئے نہ ان سے کوئی پردہ تھا نہ ہی تکلف۔ دوسرے دن وہ اتفاقاً ڈرائینگ روم کی طرف سے گزر رہی تھی تبھی ''سنو'' کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مرتضٰی بھائی اسے آواز دے رہے تھے۔ کچھ دیر وہ دم بخود کھڑی رہی، دل چاہا وہاں سے کھسک جائے۔ لیکن ان کے بار بار آواز دینے پر اسے ان کے پاس جانا ہی پڑا۔

''کیا ہے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''پہلے اطمینان سے بیٹھو تو۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔''، مجھ سے؟ مجھ سے کیا پوچھنا ہے آپ کو؟'' وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''سوال کچھ مشکل نہیں ہے۔ صرف اتنا پوچھنا ہے کہ تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟''

وہ ہکا بکا رہ گئی۔ یہ کیسا سوال کر دیا انہوں نے۔ آج تک تو کسی نے مجھ سے اس قسم کی باتیں نہیں کی ہیں۔ ''خاموش کیوں ہوگئیں، کوئی جلدی نہیں ہے اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دینا۔

''میں اب جاؤں؟'' اسے یہاں کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا جب وہ وہاں سے نکلی تو اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ مرتضٰی بھائی نے یہ کیسا سوال کیا اور کیوں کیا؟

جس موضوع پر آج تک وہ خود نہ سوچ سکی وہ بھلا کسی دوسرے کو کیا بتائے گی۔

کئی دنوں تک یہ واقعہ اس کے ذہن پر مسلط رہا پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن ایک دن اچانک پھر انہوں نے اس کا راستہ روک لیا اور پھر وہی سوال دہرایا۔ اس نے گھبرا کر اپنے آس پاس دیکھا۔ اسے بہت شرمندگی محسوس ہورہی تھی اور وہ نروس بھی تھی۔

''دیکھئے مرتضٰی بھائی میں نے تو کبھی اس موضوع پر سوچا ہی نہیں۔ یہ سوچنا تو میرے بزرگوں کا کام ہے۔'' آخر دل کڑا کر کے اس نے کہہ ہی دیا۔

''اگر نہیں سوچا ہے تو اب سوچ لو۔ زندگی تمہاری ہے۔ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ کیا تم اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہو؟

''ہاں! میں یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہوچکی ہوں کہ اب تعلیم ہی کا سہارا لے کر خود کفیل بنوں گی۔''

دیکھو تم ابھی ناسمجھ ہو اتنی دور تک تمہاری سوچ نہیں پہنچ سکتی کہ اپنی کفالت کرنا ہی بڑی بات نہیں ہے۔ رزق تو ہر جاندار کسی نہ کسی طرح حاصل کر ہی لیتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ صنف نازک کو زندگی کے ہر موڑ پر سہارے اور تحفظ کی ضرورت پیش آتی ہے ورنہ دنیا میں یہ جو بے شمار بھیڑیے نما انسان ہیں وہ بلا تاخیر کمزوروں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور یہ جو تمہیں اپنے ابا کے اوپر گمان ہے تو وہ کب تک تمہارا ساتھ دیں گے اور تم اس ویرانے میں کب تک بھٹکتی رہوگی؟ کوئی نہ کوئی فیصلہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔

تمہاری خوبیوں سے متاثر ہوکر کوئی بھی تمہارا ہاتھ تھامنے کے لئے تیار ہوجائے گا۔

اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو جو خوش آئند بھی ہے اور مایوس کن بھی وہ وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہ سکی۔ جب وہاں سے نکلی تو اس کے ذہن میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اس نے تو سمجھا تھا کہ جینے کے لئے کسی ایک مقصد کا تعین کر لینے سے زندگی سہل ہو جاتی ہے لیکین ایسا نہیں تھا زندگی کی اٹھا پٹک انسان کو چین لینے نہیں دیتی۔

ooo

رات بے حد گہری تھی۔ حبس آلود فضا میں بہت گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ایسی ہی گھٹن اس کے اندر بھی تھی۔ نادیہ کا خط اس کے سامنے پڑا تھا اور وہ بار بار اسے پڑھ رہی تھی۔

پیاری نوشین بہت بہت پیار!

شاید تم ان دنوں بہت ڈسٹرب ہو، جیسا کہ تمہارے خط سے اندازہ ہوا۔ اور تم زندگی سے فرار چاہتی ہو لیکن آخر کیوں؟''

بھاگنے سے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ یہ زندگی بہت پیاری اور اہم شئے ہے۔ اسے اس طرح کوئی ضائع نہیں کرتا۔ ہنس کر یا رو کر جینے کی راہ نکال ہی لیتا ہے۔ انسان کو حالات سے سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت اللہ نے بخشی ہے تم بھی اپنی زندگی سے مایوس نہ ہو۔

تم نے پڑھائی کا سلسلہ شروع کیا ہے یہ بہت اچھا مشغلہ ہے۔ لیکن جو بات تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ ذرا اس پر بھی غور کرو۔

خوش قسمتی بار بار کسی کے دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ یہ تو تمہارے صبر کا انعام ہے کہ اس شخص کے دل میں تمہارے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔

لوگ کیا کہیں گے، کیا سوچیں گے، تمہاری یہ گردان سن سن کر میں پریشان ہوں۔

ارے لوگوں کا کیا ہے۔ وہ کسی کا بھلا چاہتے ہیں؟ کسی کو خوش دیکھ سکتے ہیں؟ ان کا تو کام ہی اعتراض کرنا ہے۔

''میری مانو تو آنکھ بند کر کے اس شخص کا ہاتھ تھام لو۔ آئی ہوئی نعمت کو ٹھکرانا کفران نعمت ہے۔

اس نے خط تہہ کر کے لفافے میں ڈالا اور ایک سرد آہ بھر کر دل ہی دل میں گویا ہوئی۔

تم لندن جا کر اپنے ملک کی ساری خوبیاں اور خامیاں بھول گئیں۔ لوگوں کے طنز، زمانے کی باتیں، رسوائیوں کے بھوت بدنامیوں کے وسوسے۔

اب میرے دل میں ان حالات سے گزرنے کی طاقت نہیں ہے۔

ooo

کئی ہفتے گزر گئے تھے لیکن کوئی نیا واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا تھا۔ یہ بات اس کے لئے سکون بخش تھی وہ حتی الامکان مرتضٰی کی نظروں کے سامنے آنے سے گریز کرتی اس لئے زیادہ تر کمرے میں لکھتی پڑھتی رہتی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی شخصیت کا کوئی کمزور پہلو عدیل کی نظروں کی زد میں آجائے۔

لیکن عجیب اتفاق تھا کہ ایک شام عصر کی نماز پڑھ کر جوں ہی وہ کمرے سے نکلی، مرتضٰی بھائی نے اس کا راستہ روک لیا۔ خلاف توقع اس روز وہ انسٹیوٹ سے جلد واپس آگئے تھے۔

''کہاں بھاگی جارہی ہو؟'' انہوں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

اس کا جی چاہا وہ سچ میں وہاں سے بھاگ جائے۔ ان کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی لیکن کسی ان دیکھی طاقت نے اس کے قدم روک لئے۔ ''بیٹھو! انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کوئی خاص بات ہے؟''، ''ہاں خاص ہی سمجھو۔ میں اپنے جواب کا ہنوز منتظر ہوں۔'' آپ یہ خیال دل سے نکال دیجئے مرتضٰی بھائی۔ کیا میں آپ کی زندگی میں شامل ہوکر، آپ کو وہ سکون دے سکوں گی، جو آپ کا حق ہے؟ شاید آپ مجھ پر ترس کھارہے ہیں۔ ورنہ بھلا کوئی مجھ سے کیسے محبت کرسکتا ہے۔ میں تو وہ بدنصیب ہوں جو بچپن سے لے کر اب تک زندگی کے ہر موڑ پر ہر چاہت سے محروم ہوچکی ہوں۔

''تم ایک بار میری محبت پر بھروسہ کر کے تو دیکھو۔ میں وہ تمام گلے شکوے اور محرومیاں دور کردوں گا جو تمہیں اپنی زندگی سے ہیں۔

وہ خاموش رہی اور جلد اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بری طرح منتشر ہورہی تھیں۔

ساری رات وہ سو نہ سکی۔ خیالوں کا ایک ہجوم تھا جو رہ رہ کر اس کے ذہن کو بوجھل کررہا تھا۔ وہ دیر تک ہر پوائنٹ پر سوچتی رہی۔ پھر اس نتیجے پر پہنچی کہ اس چیپٹر کو ہمیں بند کرنا ہوگا۔ ورنہ بات پھیلے گی تو بہت دور تک جائے گی اور سوائے رسوائی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

حالات سے فرار حاصل کرنے کا اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اب اپنی زندگی کے باقی ایام سسرال میں ہی گزار دے گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ شریف

گھرانے کی لڑکیوں کا ڈولا جہاں جاتا ہے وہیں سے اس کا جنازہ بھی اٹھتا ہے۔ چاہے حالات جیسے بھی ہوں اور اب اس نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔

جب اس نے ابا سے اجازت لی تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ ''یہ اچانک تمہیں وہاں جانے کی کیا سوجھی۔ ابھی تو تم اکزام کی تیاریاں کررہی تھیں۔''

''گھر ہی بیٹھ کر جب پڑھنا ہے تو تیاریاں تو میں وہاں بھی کرسکتی ہوں۔'' اس نے بہت ہی رسانیت سے کہا۔ ''ٹھیک ہے جاؤ لیکن جلد آنے کی کوشش کرنا۔''، ''جی'' وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

پھر یہ خبر پورے گھر میں پھیل گئی۔ مرتضٰی بھائی نے بھی سنا ہوگا۔ اس خبر کاری ایکشن ان پر کیا ہوا، اسے نہیں معلوم۔

ooo

جانے کا فیصلہ تو اس نے کرلیا تھا لیکن اندر سے بہت ہی مایوس اور ڈسٹرب تھی۔ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ اس کی پڑھائی کا تو ستیاناس ہوگیا۔ دیہات میں نہ تو پڑھائی لکھائی کا ماحول نہ کوئی ذریعہ تھا اور شاید سسرال والوں کو یہ بات ناگوار بھی گزرے۔ اسے یاد آیا جب وہ پچھلی بار وہاں گئی تھی تو کہیں سے اسے ایک رسالہ مل گیا تھا اور وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہی تھی تبھی دیور وہاں پر آکر کھڑے ہوگئے۔

''بھابھی آپ نے یہ کیا مردوں والا شوق پال لیا ہے؟ ہمارے یہاں کی عورتوں کا مشغلہ تو گھر گرہستی اور بچوں کی پرورش ہے۔ اور یہی انہیں زیب بھی دیتا ہے۔ اور اسی روپ میں وہ اچھی بھی لگتی ہیں۔''

''اسی نے رسالہ ایک طرف دکھ دیا اور بڑی رسانیت سے بولی۔
اسی لئے تو آج تک آپ کی بیگم کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں دیکھی۔''

''ہاں جس عورت نے یہ آلتو فالتو شوق پال لیا اس کے گھر کا تو بیڑا ہی غرق ہوجاتا ہے''

''کہاں ہے اس کا گھر؟ کہاں ہے اس کی خانہ داری اب تو کہیں بھی حکم کا غلام بن کر رہنا ہے۔'' یہ اس کے دل کی آواز تھی لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لائی البتہ یہ ضرور جتایا کہ۔

''آپ تو کہتے تھے میرے نانا بہت بڑے شاعر تھے اور نانی بڑی قابل عورت تھیں۔ پھر یہ جہالت والی باتیں کیوں؟ کیا جو عورتیں بچوں کی پرورش کرتی ہیں۔ خانہ داری سنبھالتی ہیں ان کا تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا؟''
اس کا دل بڑا ہوگیا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ زیادہ بحث مباحثہ کرنا نہیں جانتی تھی۔ وہ تو دوسرے ہی ماحول کی پروردہ، دوسری ہی زندگی کی متلاشی تھی۔ لیکن اب پھر حالات سے مجبور ہوکر اس نے وہاں جانے کا قصد کرلیا تھا۔اب اکثر اسے رات میں نیند آتی۔متفرق اور متضاد سوچیں جب انسانی ذہن کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہیں تو لگتا ہے انسان منجدھار میں پھنس گیا ہے۔

اس رات بھی وہ جاگتی رہی تھی۔ اسے کسی صورت نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم کے ورانڈے پر ٹہل رہی تھی۔ گرچہ سردی کی آمد آمد تھی پھر بھی شبنم سے بھیگی ہوئی رات بہت ہی فرحت بخش تھی۔ وہ دیر تک ٹہلتی رہی تھی۔

سوچتے سوچتے اس کا ذہن تھک گیا تھا، کسی برے نتیجے کا خوف دامن

گیر تھا۔ کسی آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کچھ دوری پر مرتضیٰ کھڑے تھے۔ شاید وہ کچن میں پانی پینے کے لئے آئے تھے۔ اسے دیکھ کر اس کے پاس آگئے۔ ''یہاں پر کیا کررہی ہو'' انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''یونہی، نیند نہیں آرہی تھی تو ادھر ٹہلنے کے لئے آگئی۔

''شاید تم جارہی ہو، کیا سچ میں تم نے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے؟''، ''جی اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پھر یہ لکچر دینا شروع نہ کردیں۔ ''ٹھیک ہے جاؤ مگر ایک بار اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی ضرور کرنا۔''

OOO

جب وہ سسرال پہنچی تو اس کا استقبال بڑی ہی سرد مہری سے کیا گیا ہے۔ کسی کے چہرے پر خوشی کی تھوڑی سی جھلک نہ تھی جیسے انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ ایک بار پھر اپنا حق وصول کرنے کے لئے تو نہ آگئی۔

لیکن اب اسے اپنا حق کیا مانگنا اور کس سے مانگنا تھا۔ سر تو گزر چکے تھے۔ بس پڑے رہنے کے لئے تھوڑی سی جگہ درکار تھی۔ اپنی حیثیت کا تعین اس نے اچھی طرح کرلیا تھا وارنڈے پر بچھے ہوئے کھرے تخت پر وہ بیٹھ گئی گزرے ہوئے چھ سالوں کا ایک ایک واقعہ اس کے ذہن کے پردے پر ابھرنے لگا۔

جب وہ پہلی بار دلہن بن کر اس گھر میں آئی تھی تو شوہر کے لاپروا اور خشک رویہ کے باوجود اس نے انہیں دل سے قبول کرلیا تھا۔ اور یہ چار دن خوشگوار ماحول میں گزارنے کی کوشش کی تھی۔

جب وہ دوسری بار آئی تو وہ ایک تقریب کا موقع تھا تقریب ختم ہوتے

ہی وقار چلے گئے کیونکہ نئی ملازمت تھی زیادہ دن چھٹی نہیں لے سکتے تھے اور وہ تنہا رہ گئی تھی۔ اس گھر میں صرف مرد ہی مرد تھے۔ رشتہ دار عورتوں کا بلا وجہ کس کے گھر آنے جانے کا رواج نہ تھا۔

اس دن وہ سارا دن بولائی بولائی پھرتی رہی۔ ''یہ وہ کہاں آ پھنسی۔ اس ویرانے اور اجنبی ماحول میں اپنا وقت کس طرح گزارے گی؟''

اس کی آنکھوں سے متواتر آنسو گر رہے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر اسی حالت میں روتے روتے نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

اس نے دیکھا کہ ایک سبز شاداب بہت ہی خوشنما باغ ہے وہاں وہ وقار کا ہاتھ تھامے ٹہل رہی ہے لیکن جلد ہی وقار نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ دوسری طرف چلے گئے۔ وہ پریشان ہو کر انہیں آواز دینے لگی۔

''مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ میں کدھر جاؤں۔ مجھے راستہ معلوم نہیں۔ وہ ابھی چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھی کہ آنکھیں کھل گئیں۔

یہ کیا خواب تھا؟ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خواب کے اثرات دیر تک دل و دماغ پر چھائے رہے۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ وہ بار بار خود کو سمجھاتی۔ ''خواب کا حقیقت سے کیا تعلق۔ یہ تو ذہن کی اختراع ہے۔''

بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا اور جب تک وہاں رہی نارمل رہنے کی کوشش کرتی رہی۔

ہر ویک اینڈ پر وہ وقار کا انتظار کرتی کیونکہ جہاں ان کی پوسٹنگ تھی وہ شہر وہاں سے قریب تھا پھر بھی شاید ہی وہ کسی ویک اینڈ پر آتے لیکن جب بھی

آتے ان سے کوئی شکایت نہ کرتی۔

تیسری بار جب وہ آئی تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ جس نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا اس نے آغازِ سفر میں ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ تب اسے اپنا وہ خواب یاد آیا جواب حقیقت بن کر اُسے رلا رہا تھا۔

اس کی زندگی کا یہ دوسرا سانحہ تھا جسے وہ سہہ نہیں پا رہی تھی۔ لیکن کسی صورت اسے سہنا ہی تھا کیونکہ وہ ایک مقصد کے لئے وہاں آئی تھی۔ لوگوں کو خوش کر کے ان کے دل میں اپنی جگہ بنا کر ہی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی تھی۔

دیور کی شادی میں اس نے سارے انتظام اور سارے کام اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ پورے گھر میں دووڑ دوڑ کر کبھی مہمانوں کی خاطر تواضع کرتی تو کبھی دلہن کی۔ پھر بھی ناکام واپس گئی کہ اب کبھی واپس نہ آئے گی۔ اب یہاں آنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا کہ کسی نے تو اس کے مستقبل کی ضمانت نہیں دی۔ لیکن جب چھوٹے دیور کی شادی کی خبر دی گئی تو پھر ایک موہوم سی امید لے کر ایک بار پھر وہاں آ گئی۔

ooo

اب اندر باہر منجھلے دیور اور دیورانیوں کا دور دورہ تھا۔ وہ کمرہ جس میں وہ دلہن بن کر اتری تھی وہ منجھلے دیور کی شادی کے موقع پر ہی خالی کروا دیا گیا تھا اور جواز یہ پیش کیا گیا تھا کہ یہ کمرہ دلہنوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور پھر اسے فوراً چھوٹے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اور اب اس چھوٹے کمرے سے بھی بے دخل کیا جا رہا تھا۔ اس کا سامان سہ درہ میں سٹ کر دیا گیا، جس میں

فاضل سامان رہتا تھا، یا کبھی کبھی گیسٹ روم کے طور پر ستعمال ہوتا تھا۔ گویا اب اس کی حیثیت کوڑے کباڑے جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس طرح وہ ایک کمرے سے دوسرے اور پھر تیسرے، مسہری سے پلنگ اور پلنگ سے چوکی پر منتقل ہوتی رہی۔

وہ وقت اس کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ ایک وہ جب وہ بھائی کے یہاں حصول تعلیم کے لئے گئی تھی اور نامراد واپس آئی تھی۔ اور دوسرا یہ جب وہ قسطوں میں اپنے حقوس بے دخل کی جارہی تھی۔

گزرے ہوئے وقت کا ایک کرب انگیز منظر اس کے تخیل کے پردے پر ابھر آیا۔

وقار ہاسپٹل کے ایک بڈ پر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ حالت رہ رہ کر بگڑ رہی تھی۔ وہ ان کے پاس بیٹھی تھی تبھی بڑی حسرت سے انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اب تمہارا کیا ہوگا'' تب اس نے مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا اور ہچکیوں سے رو پڑی تھی۔ لیکن پل بھر میں ہی وہ ہاتھ اس کے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا تھا۔ اور اب یہ آواز مسلسل اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ''اب تمہارا کیا ہوگا؟'' اب تمہارا کیا ہوگا؟'' اس وقت تو وہ کچھ نہ سمجھ پائی تھی لیکن یہ احساس تو اب ہورہا تھا کہ بنا چھت کی عمارت کتنی نامکمل اور غیر محفوظ ہوتی ہے، جہاں آندھی طوفان، بادلوں کی گرج بجلی کی کڑک کی زد میں آنے کا خدشہ اور خوف ہر وقت لگا رہتا ہے۔ ''بھابھی! سہ درہ میں آپ کے لئے پلنگ بچھوادیا ہے اور سامان بھی وہیں رکھوادیا ہے۔'' اس نے پلٹ کر دیکھا، سامنے دیورانی کھڑی تھیں۔ وہ خیالوں سے باہر آگئی اور سوزِ دل کی تپش برداشت کرتے ہوئے مسکرادی۔ آنکھوں سے بے تحاشہ

بہتے ہوئے آنسو کو آنچل کے کونے سے صاف کیا پھر آنگن میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ کے پاس جا کر پانی کے دو چار چھینٹے چہرے پر مارے اور اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کے لئے بستر لگایا گیا تھا اور جہاں دیور کے بچے کی کھلائی بھی سوتی تھی۔

وہ جو اتنی حساس، اتنی انا پرور تھی لیکن وقت کی آندھی سب کچھ اڑا کر لے گئی تھی۔ درد سے اس کا کلیجہ شق ہو رہا تھا۔ لیکن وہ کمالِ ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

ooo

پڑھائی لکھائی کو تو اب اس نے بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ زندگی یونہی بے مقصد گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی وقت گزاری کے لئے کسی کتاب کا مطالعہ کرتی تو اسے ایسا لگتا کہ کئی کڑی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ اپنی مرضی سے کچھ نہ کر پائے گی۔ آگے کا راستہ اب اس کے لئے مسدود ہو چکا ہے۔ یہ شب و روز جس طرح گزر رہے تھے اس کا اثر اس کی حساس طبیعت نے بہت زیادہ لیا تھا۔

کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ کسی قید خانے میں مقید ہے۔ پھر جھنجھلا کر سوچتی، اس قید خانے کا انتخاب تو اس نے خود اپنی مرضی سے کیا پھر کیا پریشانی ہے۔ اب تو زندگی کے آخری ایام تک اس میں رہنا ہے۔ کوئی نہ کوئی تو اسے آخری منزل تک پہنچا ہی دے گا۔

یہ سب سوچتے ہوئے اس کے اندر گھٹن بڑھنے لگتی اسے سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے نہ تو کوئی روزن تھا نہ دروازہ۔

وہ کس جرم کی سزا کاٹ رہی تھی۔ یوں تو اس کی زندگی غیر متوقع حادثوں سے بھری تھی لیکن اب اسے ایسا لگتا کہ وہ بالکل ٹوٹ گئی ہے۔

ان گزرے ہوئے وقتوں نے اسے بالکل بدل دیا تھا۔ نہ وہ ہمت تھی نہ وہ جوش تھا۔ زندگی نے منفی رخ اختیار کرلیا تھا۔ انسان کی زندگی کا وہ دور جو بہت ہی خوبصورت اور امنگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ اس کا وہ دور تو آنسو بہاتے اور آہیں بھرتے گزر گیا۔

زیست کے گزرے ہوئے ان چند سالوں کے اوراق جب وہ پلٹ کر دیکھتی تو اپنا دامن ہر خوشی، ہر جذبے سے خالی پاتی۔ اور اب اس نے مستقبل کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اور ماضی پر نظر ڈالنا نہیں چاہتی تھی کہ اب اس سے کیا لینا دینا۔ حال جیسا بھی ہے اب اسی میں اسے جینا ہے۔

ooo

ابا کے کئی خطوط آچکے تھے۔ انہیں تعجب ہورہا تھا کہ وہ اتنے دنوں تک وہاں کیوں رہ گئی، جب کہ اسے اکزام کی تیاریاں بھی کرنی ہے۔ آخر وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ پچھلے خط میں انہوں نے اسے بہت ڈانٹا تھا، سمجھایا تھا اور جلد سے جلد آنے کی تاکید کی تھی۔ اور وہ جو تہیہ کئے بیٹھی تھی کہ اب بلا وجہ وہاں نہیں جائے گی وہ ابا کی ایک ڈانٹ اور خط پاکر ایک دم پگھل گئی۔

خدا کا احسان تھا کہ وہ کسی کے دباؤ میں نہ تھی، سو جلد ہی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اور اسے روکتا بھی کون، کس کو پڑی تھی۔ وہ کس کے لئے اتنی اہم تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں جاتے وقت وہ بہت ہی اداس تھی۔

ابا ریٹائر ہوچکے تھے اور شہر میں لب سڑک ایک خوبصورت سا بنگلہ

بنوا کر وہاں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ وہ یہاں پہنچ کر ایک دم ہشاش بشاش ہو گئی۔ پُرشوق نظروں سے گھوم گھوم کر پورا بنگلہ دیکھ رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ پاتال سے ایک دم باہر نکل آئی ہو۔

رات کھانے کے بعد وہ گپ شپ کر رہی تھی تبھی اس کی طلبی ہوئی۔ ابا نے اسے بلایا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے ان کے پاس پہنچی۔

''یہ کون لڑکا ہے؟ ابا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

میرے رشتے کا دیور ہے۔ میرے ساتھ آیا ہے''، ''اسے کل ہی چلتا کردو اور اب ان لوگوں سے زیادہ تعلقات بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ابا شاید اس کے سسرال والوں سے بہت زیادہ ناراض تھے۔ ''اور ہاں اب اسٹڈی میں لگ جاؤ، کوشش کرو کہ اسی سال اکزام دینے کے لائق ہو جاؤ۔''

جاتے جاتے انہوں نے روک کر اس سے کہا۔

''ابا جب بھی اس سے باتیں کرتے ان کی آنکھوں میں شفقت کی پرچھائیاں اسے یہ یقین دلاتیں کہ والدین کی محبت اور شفقت اولاد کے لئے خدا کا ایک انمول انعام ہے جس کا نعم البدل کوئی شئے نہیں۔ وہ اپنی بے کراں چاہتوں کا خزانہ اپنی اولاد پر لٹاتے رہتے ہیں اور یہ شفقتیں ان کی زندگی کے سفر کے لئے زاد راہ بن جاتی ہیں۔ اور اس کے لئے تو یہ بیش قیمت سرمایہ حیات بھی ہے۔

ooo

زندگی ایک نقطہ پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ ایک ڈھرے پر چل رہی تھی۔ صبح

سے شام تک اور رات کے پہلے پہر تک وہ مطالعہ میں مشغول رہتی۔ سارے خرافات اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دینے کی کوشش کرتی، لیکن بیتے دنوں کی تکلیف دہ یادیں اسے اکثر رلاتیں۔لوگوں کی کہی ہوئی یہ بات اکثر اسکی سماعتوں سے ٹکراتی۔ ''خوش رہو اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھو کہ ماضی بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ نادیہ بھی یہی کہتی تھی۔ ''زندگی بڑی قیمتی شئے ہے۔ اسے یوں ضائع نہ کرو اسی میں اپنی خوشیاں تلاش کرو۔'' لیکن وہ سوچتی، اگر زندگی میں خوشی کا ایک لمحہ بھی میسر نہ ہو تو بھلا انسان کیسے خوش رہ سکتا ہے۔؟''

ماضی تو واقعی راکھ کا ڈھیر بن چکا ہے لیکن اس سے نکلتی ہوئی چنگاریوں کی تپش اب بھی محسوس ہوتی ہے۔''

اس نے لائٹ آف کی کتابیں سائڈ ٹیبل پر رکھیں اور آنکھیں بند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

ooo

اسے یہاں آئے ہوئے لگ بھگ ایک سال ہو چکا تھا۔ اس بیچ اس نے جان توڑ محنت کی تھی اور اب میٹرک کے اکزام میں اپیئر ہونے کے لئے ٹسٹ ہونے والا تھا۔ تیاری مکمل ہوئی تھی یا نہیں، اس کا اندازہ اسے نہیں تھا لیکن بہرحال اکزام تو اسے دینا ہی تھا۔

جب پہلے دن وہ اکزامیشن ہال میں داخل ہوئی تو بہت ہی نروس تھی۔ کیونکہ یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ لیکن خدا کا شکر کہ سارے پیپر اچھے گئے تھے۔ وہ وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتی کیونکہ پہلی بار اس نے کوئی اکزام دیا تھا۔

جس دن رزلٹ نکلنے والا تھا اس دن وہ اور زیادہ نروس تھی۔ دس بجے

تیار ہوکر اور دو رکعت نفل پڑھ کر وہ اسکول پہنچ گئی۔ جب گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو دیکھا چند لڑکیاں آپس میں کھسر پھسر کررہی تھیں اور اور بار بار اس کا نام لے رہی تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکا، ضرور کوئی گڑ بڑ ہوگئی ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی تو دیکھا ایک بینر پر اس کا نام اور کچھ اور بھی لکھا تھا۔ تبھی ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ ''ارے نوشین! تم تو سبجکٹلی پاس ہوگئیں'' ہاں جتنی لڑکیاں اپیئر ہوئی تھیں ان میں وہ واحد لڑکی تھی جو سبجکٹلی سینٹ اپ ہوئی تھی۔

لڑکیوں نے اسے مبارک باد دی، ماسٹروں نے بھی شاباشی دی۔ فارم وغیرہ بھر کر جب وہ واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی بڑی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ لیکن میٹرک میں تین نمبر کے لئے فرسٹ ڈیویزن چھوٹ گیا۔ جب انسان کو کوئی خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ ہواؤں کے دوش پر اڑنے لگتا ہے اور اگر ذرا بھی کمی ہوجاتی ہے تو منہ کے بل زمین پر گر جاتا ہے۔ اس کا بھی یہی حال تھا ''شاید میری تیاری میں کوئی کمی رہ گئی ہو۔ پھر فوراً ہی اسکے دل نے اس کی تردید کی۔ ایک سال میں اس سے بڑھ کر اور کیا تیاری ہوسکتی تھی اس نے افسردگی سے سوچا۔

OOO

جب اسے مارکس شیٹ ملے تو اسے یہ دیکھ کر خوشی اور اطمینان ہوا کہ اردو میں اسے ہائی مارکس ملے تھے اور اسے اردو میں ہی آگے جانا تھا۔ اس لئے کہ اردو اس کی مادری زبان ہے اور روایتی اور تہذیبی زبان بھی۔ اردو سے ایک جذباتی تعلق بھی تھا۔ وہ اردو رسالے ہی پڑھا کرتی تھی۔ اردو افسانوں

سے اسے گہری دلچسپی تھی، اردو شاعروں کی شاعری خاص طور پر غزلوں کا مطالعہ دلچسپی سے کیا کرتی تھی۔ اسے میر و غالب، مومن، ذوق اور اقبال و جوش کے علاوہ کئی دوسرے شاعروں کے بہت سے اشعار یاد تھے اور وہ اکثر اپنے پسندیدہ اشعار گنگنانے بھی لگتی تھی اور اس کے لئے اکثر اسے دادی اماں کی مٹھاس بھری ڈانٹ بھی سننی پڑتی تھی۔

اس کی ابتدا سے اب تک کی تعلیم تو اردو ہی میں ہوئی تھی اس کے لئے اردو اظہار خیال کا بہترین ذریعہ تھی۔ اپنے پرایوں سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی اردو ہی میں تھا۔ خاص طور سے اپنی شریک دل سہیلی نادیہ کو بھی اس نے جتنے خطوط لکھے تھے، اردو میں ہی لکھے تھے۔ نادیہ کے خط بھی اردو میں ہی آیا کرتے تھے، نادیہ خود بھی اردو ہی جانتی تھی اور خوش خط بھی تھی۔ زبان و بیان اور طرز و اسلوب کے لحاظ سے بھی اس کے خطوط دلچسپ ہوئے تھے۔ نادیہ بھی اکثر اس کی زبان و بیان کے سلسلے میں اس کی تعریف کیا کرتی تھی گویا دونوں ایک دوسرے کی مداح تھیں۔ کبھی وہ رشک بھی کرتی اور یہ پوچھتی کہ نوشین! تم نے ایسی زبان اور یہ خوبصورت تحریر، کب، کیسے اور کس سے سیکھی ہے؟''

اور وہ چھوٹے ابا کا مختصر سا حوالہ دے کر اسے خاموش کردیتی ایسے موقعوں پر اسے چھوٹے ابا کی یاد شدت سے آتی۔ آج بھی اچانک انکی یاد آئی کہ اس کی اس معمولی سی کامیابی پر وہ کتنے خوش ہوتے جس کا اظہار انہوں نے اپنے خط میں کیا۔

وہ جب کبھی اس سے بے حد خوش ہوتے تو اسے عاقلہ بوا کہہ کر مخاطب کرتے۔ آج اگر وہ پاس ہوتے تو شاید، عالمہ اور فاضلہ کے خطاب سے نوازتے۔ لیکن اب تو اس سے اتنی دور ہوچکے ہیں۔ وقت کافی گزر چکا ہے،

بھلا اسے کون قید کرسکتا ہے۔ البتہ لمحوں میں بٹے ہوئے وقت کو قید کرنے کی ایک یہی صورت ہوسکتی ہے کہ اسے رائیگاں نہ ہونے دیا جائے کسی اچھے کام میں لگا دیا جائے اور تعلیم سے بڑھ کر اور اچھا کام کیا ہوسکتا ہے۔ چھوٹے ابا ہمیشہ اسے یہی تلقین کرتے رہتے تھے۔

اور اب تو خاص طور سے اس کے لئے یہ اوقات گزاری کا بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ اور اردو ہی کی بدولت اسے یہ کامیابی ملی ہے۔ اسی سے اسے آئی میں داخلہ لینے کا حوصلہ بھی ملا۔

ooo

اس نے آئی اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے مقصد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لیکن انسان کچھ سوچتا ہے اور خدا کچھ اور۔ شاید یہ اس کی مرضی ہی تھی کہ، نہ جانے کیسے مرتضٰی نے اپنے والدین کو راضی کرلیا۔

اور اچانک ایک بار پھر وہ رشتۂ ازدواج سے منسلک کردی گئی۔

لیکن ابھی وہ ان نئے حالات سے کوئی سکون، کوئی خوشی حاصل بھی نہ کر پائی تھی کہ معنی خیز نظروں کا نشانہ بن گئی۔ کوئی طنز کے تیر برساتا تو کوئی بھپتیاں کستا، کوئی محفل ہو یا کوئی تقریب اسے دیکھ کر لوگ چہ می گوئیاں کرنے لگتے۔ وہ جلد وہاں سے اٹھ جاتی کہ کہیں کوئی اس سے الٹے سیدھے سوال نہ کر بیٹھے۔ گویا وہ معاشرے کی نظروں میں مجرم اور گنہگار تھی آخر کیوں؟ جو جرم اس نے کیا ہی نہیں، جس میں اس کے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ پھر بھی وہ اس جرم کی مرتکب کیوں گردانی جارہی تھی؟

پورے آٹھ سالوں تک اس کی کشتی حیات سمندر کی تیز لہروں پر بنا پتوار کے ڈولتی ڈگمگاتی رہی۔ تیز ہواؤں کے تھپیڑے اپنے ناتواں جسم پر سہتی رہی۔ تب کسی نے ہمدردی کا ایک لفظ نہ کہا۔ اور جب وہ اپنے تلخ ماضی کی یادوں کو فراموش کر کے حال میں جینا چاہتی تو لوگ اسے جینے نہیں دیتے اس کے مندمل ہوتے ہوئے زخموں کے ٹانکے بے دردی سے ادھیڑتے رہتے۔ کچھ دنوں تک وہ لوگوں کے لئے دلچسپ موضوع بنی رہی۔

پھر وہ بولتے بولتے تھک گئے یا شاید وہی سنتے سنتے بے حس ہوگئی تھی کہ اب اس کے چہرے پر آسودگی اور اطمینان مترشح تھے۔

وہ بہت ہی پر سکون ہوگئی تھی۔ جیسے کوئی مسافر پا پیادہ مسافت طئے کرنے کے بعد کسی گھنی ٹھنڈی چھاؤں میں سکون کی نیند سو رہا ہو۔

ooo

جب وہ پہلی بار شوہر کے ساتھ اپنے نئے گھر میں داخل ہوئی تو بہت ہی پر سکون تھی۔

اب اس کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا۔

"ہاں یہی وہ گھر ہے جو اس کا اپنا ہے۔ جس کی مدت سے اسے چاہ تھی۔ ازل سے ہر عورت ایسے ہی گھر کا خواب دیکھتی آئی ہے۔ بھلے ہی وہ ایک سرکاری کوارٹر تھا۔ لیکن یہ اس کی اپنی سلطنت تھی۔ بلا شرکت غیرے وہ یہاں کی حکمراں تھی۔

وہ مرتضیٰ کی شکر گزار تھی جنہوں نے ہزار ہی مخالفت اور اس کی ہر کمی اور محرومی کے باوجود اسے قبول کر لیا تھا۔ وہ اکثر سوچتی اگر انسان کے جذبوں

میں صداقت ہو، ارادے میں پختگی ہو اور اللہ پر کامل یقین ہو تو وہ ہر وہ کام کر جاتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے جب اس نے نئے سرے سے اپنی ازدواجی زندگی کا سفر شروع کیا تو بہت ساری آرزوئیں، شوہر کی چاہتیں اور ان کا اعتماد ساتھ لے کر چلی تھی سو اس نے بڑی ایمانداری سے اپنا سب کچھ، اپنی خوشی، اپنا غم، اپنا دکھ اپنی پریشانی، اس شخص کے حوالے کر دئے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں گزرے ہوئے وقت کا کوئی گزرا ہوا لمحہ، کوئی واقعہ اس کی ازدواجی زندگی پر اثر انداز نہ ہو۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی سابقہ ڈیڑھ سالہ ازدواجی زندگی کا ہر ایک لمحہ ہر یاد کو دفن کر دیا۔ اس شخص کے لئے جس نے اس کے ٹوٹے پھوٹے اور بکھرے وجود کو سمیٹ لیا۔

معاشرے میں ایک مقام دیا، عزت دی، اپنا نام اور تحفظ دیا۔

بہت دنوں بعد ایک بار پھر اسے دنیا حسین نظر آنے لگی۔

ooo

یہ پہلا اتفاق تھا کہ مرتضٰی دو دنوں کے لئے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ فلیٹ میں بالکل تنہا تھی۔ رات ہوتے ہی اسے خوف آنے لگا اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا پھر بھی خوف کم نہ ہوا تو کھڑکیاں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن ہر آہٹ پر چونک جاتی اور ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ اگر ہوا بھی ذرا زور سے چلتی تو دل دہل جاتا۔ تب اسے نادیہ کی کہی ہوئی بات یاد آنے لگتی۔ ''عورت چاہے جتنی ہی بولڈ کیوں نہ ہو، اسے کبھی نہ کبھی مرد کے سہارے کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔''

اور وہ تو سدا کی ڈرپوک تھی۔ کبھی اکیلی کمرے میں نہ سو سکی لیکن اب

اکثر اسے رات دیر دیر تک تنہا رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ مرتضٰی کبھی کبھی رات دیر سے لوٹتے تھے۔ اس روز بھی گھڑی بارہ کا ہندسہ پار کررہی تھی انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر جب گھنٹی بجی تو اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

کیا وقت ہوا ہے گھڑی دیکھی ہے آپ نے؟'' میں انتظار کر کے تھک جاتی ہوں، تنہا پریشان ہوجاتی ہوں، وہ پہلی بار ان سے کوئی شکوہ کررہی تھی۔

''ہاں آج کچھ کام بھی زیادہ تھا پھر ایک عورت میرے آفس میں آگئی وہ یہاں کالج میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئی ہے۔

کیا غضب کی عورت ہے مردوں پر چھاجانے کا فن جانتی ہے۔ اپنے اندر مخالف جنس کے لئے بے حد کشش رکھتی ہے۔ حالانکہ عمر دراز ہے۔''

''بس بس۔'' اس نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔''اب چپ چاپ سوجائے۔ صبح سویرے اٹھنا بھی پڑتا ہے۔'' ہونہہ وہ منہ میں ہی بدبدائی۔

''یہ مرد حضرات بھی عجیب ندیدہ قسم کی مخلوق ہوتے ہیں۔ جہاں اچھی صورت دیکھی رال ٹپکنے لگی۔ چاہے وہ ان سے دس سال بڑی ہی کیوں نہ ہو۔ نہ جانے کیسے اچانک اسے کسم دیدی یاد آگئیں۔ وہ بھی کتنی خوبصورت تھیں۔ مرد تو مرد عورتیں بھی انہیں ایک بار دیکھ کر کبھی نہ بھولتیں۔ نہ جانے اب کیسی ہوں گی، کیا کررہی ہوں گی، کہاں تک تعلیم پائی ہوگی، شروع میں ان سے رابطہ تھا۔ پھر وہ زندگی کے گرداب میں ایسی پھنسی کہ کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ اور دھیرے دھیرے رابطہ ٹوٹ گیا۔ پھر اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا۔ اچانک اسے کسم دیدی کیوں یاد آنے لگیں۔ اس بات سے ان کا کیا تعلق۔

لیکن ایک دن پھر مرتضٰی نے وہی قصہ نکالا۔''جانتی ہو وہ نئی پرنسپل جو آئی ہے وہ عجیب بدنام قسم کی عورت ہے۔ بہت اونچائی تک اس کی پہنچ ہے۔

ہر طرف اس کے چرچے ہو رہے ہیں۔ وہ کوئی کم عمر نہیں ہے بلکہ ایک پختہ عمر کی عورت ہے۔ تبھی تو ایک منجھی ہوئی کھلاڑی ہے۔"

نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے پوچھ لیا "اس کا اتہ پتہ کیا ہے؟ کہاں کی رہنے والی ہے کیا نام ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا، ٹھہرو پتہ لگا کر تمہیں بتاؤں گا۔" اور دو دنوں کے بعد جو کچھ انہوں نے بتایا، جو انکشاف ہوا، اس اس سے اس کے دل کو زبردست دھکا لگا وہ کوئی اور نہیں کسم دیدی ہی تھیں۔

رسم و رواج کے کالے ناگ نے عزت و ناموس کو نگل لیا تھا۔

OOO

یوں تو اس کے لئے شوہر کا ساتھ ہی کافی تھا، لیکن انسان تو سماجی حیوان ہے۔ وہ سماج سے کٹ کر کیسے رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے آس پاس والوں سے راہ و رسم بڑھانا شروع کر دیا۔

وہ ایک خوبصورت جگمگاتی ہوئی کالونی تھی۔ جہاں ہر ذات ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ ان میں زیادہ تر آبادی غیر مسلم کی تھی لیکن ان میں ذات پات اونچ نیچ کا کوئی بھید بھاؤ نہ تھا۔ سب مل جل کر رہتے ایک دوسرے کے دکھ درد، خوشی غمی میں شریک ہوتے، عید میں گلے ملتے۔ ہولی میں رنگ گلال کھیلتے۔

رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد جب عورتیں اپنے اپنے کاموں سے فرصت پا جاتیں تو آٹھ، دس کا گروپ بنا کر چہل قدمی کے لئے نکل جاتیں۔ جب تھک جاتیں تو کسی موڑ پر بیٹھ کر تبادلۂ خیال کرتیں۔ وہاں کا ماحول اتنا

صاف ستھرا تھا کہ کوئی ڈر خوف نہ ہوتا۔ راہ چلتے لوگ آہستہ سے گزر جاتے۔ نہ تو وہ ان کی طرف دیکھتے نہ ہی کوئی جملہ کستے۔

دسہرہ دیوالی کے موقع پر بڑے بڑے پروگرام منعقد ہوا کرتے تھے۔ ایک بڑے فیلڈ میں شامیانہ لگایا جاتا۔ اسٹیج سجایا جاتا جہاں ملک کے نامی گرامی فنکار اپنا اپنا فن دکھاتے۔ ڈانسر، قوال، غزل اور بھجن گانے والے جگجیت سنگھ، پنکج اداس، انوپ جلوٹا، اور شہنائی بجانے والے بسم اللہ خاں جیسی نامور ہستیاں اس منچ پر آتیں اور لوگوں کو مبہوت کر دیتیں۔

اس موقع پر پورا فیلڈ کھچا کھچ بھرا ہوتا۔ شامیانے کے باہر خوانچے والوں کی بہت ساری دکانیں لگتیں۔ لوگ ساری رات پروگرام دیکھتے اور کھانے پینے کی چیزوں سے شغل کرتے۔

اس کے رشتہ دار بھی بطور خاص پروگرام دیکھنے کے لئے آتے۔ ساری رات انجوائے کرتے اور سارا دن اسی موضوع پر تبصرہ کرتے۔ خوب مزہ آتا، کسی تقریب جیسی گہما گہمی رہتی۔

ooo

سردیوں کی آمد آمد تھی، سورج جلد ہی آغوش مغرب میں چھپ جاتا تھا، شام کے دھندلکے جب پھیل جاتے تھے تو ایسے میں اس کا جی چاہتا کہ سرِ شام ہی بستر میں گھس جائے۔ اس روز اس کی طبیعت بھی ذرا مضمحل سی تھی۔ اس لئے وہ سویرے ہی بستر پر آ گئی۔ مرتضٰی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''کیا بات ہے آج خلاف معمول میری بیگم آرام فرما رہی ہیں۔ کہیں طبیعت دشمناں ناساز تو نہیں؟''، ''نہیں بس یونہی طبیعت ذرا سست تھی۔''

''یونہی نہیں کچھ بات ضرور ہے۔ میں عورتوں کی نفسیات اچھی طرح جانتا ہوں۔ انہیں طرح طرح کے خواب آتے ہیں۔ کبھی گاڑی، کبھی بنگلہ اور کبھی قیمتی لباس کی صورت میں۔ کہیں اس خواب نے تو تمہیں پریشان نہیں کردیا ہے۔؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور تعجب سے کہا۔''یہ آج آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے وہ سب کچھ عطا کیا ہے جو میں نے کبھی تصور میں بھی نہ دیکھا تھا۔ رہا خواب دیکھنے کا سوال تو خواب دیکھنا کوئی جرم تو نہیں جس نے مجھے اتنا نوازا ہے وہ اور بھی نوازسکتا ہے۔ اس کے خزانے میں کوئی کمی تو نہیں ہے؟''

''اب میں نے کب کہا؟''،''تو پھر یہ قیاس آرائیاں چھوڑ دیجئے۔'' مرتضٰی نے لاجواب ہوکر پوچھا۔''کیا تم واقعی خوش ہو؟''

''کیوں نہیں؟ یہ احساس آپ کو کیوں ہوا کہ میں خوش نہیں ہوں؟''،''اس لئے کہ میں نے جو چاہا تھا تمہیں دے نہ سکا۔'''' مجھے اور کچھ نہیں چاہئے، بس آپ کی توجہ اور محبت ہی کافی ہے۔''

اس کے چہرے پر محبت اور یقین کے چراغ روشن تھے۔

OOO

شام کے سائے ڈھل چکے تھے اور رات کے ملگجے اندھیرے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ لیکن مرتضٰی کے چہرے پر روشنی پھٹ رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی آفس سے آرہے تھے۔ اور بہت خوش تھے۔ ان کا پروموشن ہوگیا تھا۔ وہ بڑے ترنگ میں بول رہے تھے۔

''عہدہ اونچا ہوا تنخواہ بھی بڑھ جائے گی اور ایریر ملے گا سو الگ۔ کیا

خیال ہے کیوں نہ ہم اس پیسے سے کہیں گھومنے چلیں؟ سیر کی سیر ہوجائے گی اورہنی مون بھی، شرماؤ نہیں،ہنی مون کا کوئی وقت مقرر تھوڑے ہی ہے۔ جب دل جوان ہوا اور جیب میں پیسہ ہو تو ہنی مون ہی ہنی مون ہے۔'' وہ بہت انہماک سے ان کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، یہ وہ نہیں بول رہے ہیں پیسہ بول رہا ہے۔پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ جب وہ بجنے لگتا ہے تو اس کی دھن پر ہر کوئی ناچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ شادی ہو یا اور کوئی تقریب اس کی جھنکار لوگوں کو مدہوش کردیتی ہے۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ واہ اس میں کیا غضب کی طاقت، اس کے سہارے کیا کچھ نہیں حاصل کیاجاسکتا ہے۔قیمتی سے قیمتی شئے خریدی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کے داماد خریدنے میں بھی یہ معاون ہوتا ہے۔

ڈاکٹر انجینئر، آئی اس آفیسر، جیسا دام ویسا مال۔ سکے کی بدولت انسانوں کا بھی مول تول ہونے لگا ہے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''، مرتضٰی کی آواز پر اس نے چونک کر دیکھا۔ ''سکے کی افادیت اور اہمیت پر غور کررہی ہوں۔'' اس نے مسکراکر کہا۔''اب یہ غور وفکر چھوڑو اور سفر کی تیاریاں شروع کردو۔''

''جو حکم سرکار کا'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے بھی ہل اسٹیشن جانے کا بڑا شوق تھا۔ بہت پہلے جب وہ ناول میں کسی مال روڈ کا ذکر پڑھتی تھی تو تصور ہی تصور میں لطف اندوز ہوتی تھی۔ آج اللہ نے حقیقتاً دیکھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

بہر کیف کاٹھ منڈو جانے کا پروگرام تھا۔ یہ سفر وہ کار سے طے کررہے تھے اس لئے لمحہ لمحہ لطف اندوز ہورہے تھے۔

نیپال کے حدود شروع ہوتے ہی پہاڑوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ کہیں بڑے بڑے پیڑ تھے۔ کہیں جھرنا، کہیں کھائی، کہیں ندی نالے اور کہیں پھول اس طرح ہر طرف بکھرے ہوئے تھے کہ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ پھولوں کا شہر ہے اور شام میں جب سورج پس منظر میں چلا گیا تو ایسا لگا کہ پہاڑ کے اوپر جیسے سونا بکھر گیا ہو۔ یہ دلکش مناظر قدرت کی صناعی کے نمونے پیش کررہے تھے۔

کچھ دیر آرام کرنے کے لئے جب وہ کسی شہر میں کچھ دیر آرام کرنے کے لئے ٹھہرتے تو ایک دوسرا ہی ماحول دیکھتے، دوسری زبان، دوسری تہذیب، دوسری قسم کا لباس، سب کچھ مختلف ہوتا۔

تقریباً ڈیڑھ بجے رات میں گاڑی شہر کے اندر داخل ہوئی۔ شہر خاموش ہو چکا تھا، سڑک سنسان تھی اور وہ لوگ تنہا تھے ڈر سے برا حال تھا اور اس پر غضب یہ کہ چند منچلے شراب کے نشہ میں دھت اناپ شناپ بکتے ادھر سے گزر جاتے۔ ڈرائیور ہوشیار تھا پوچھ تاچھ کرتے ہوئے ایک رسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ خدا خدا کرکے آرام کی جگہ مل گئی۔ دو دن وہاں رہے۔ وہاں سوائے مال وغیرہ کے اور کوئی چیز قابل کشش نہ تھی۔ وہاں سے پھریو کھرا گئے وہ ایک خوبصورت اور پر فضا مقام ہے تصنع سے پاک ہر طرف قدرتی حسن بکھرا پڑا تھا۔ ایک سے ایک خوشنما پارک خوبصورت اور خوشبو دار پھولوں سے مزیّن جو دل اور دماغ کو فرحت بخشتا۔ اسے ایسا لگا کہ جنت تو اسی دنیا میں ہے۔ اس کے اندر یہ خواہش شدت اختیار کر گئی کہ وقت تھم جائے اور وہ ساری فکر سے آزاد ہوکر یونہی شوہر کا ہاتھ تھامے کشاں کشاں چلتی رہے۔

ooo

جب وہ لوگ سیر سپاٹے سے واپس آئے تو بہت ہی بشاش تھے اور اب منہ نے ذائقہ چکھ لیا تھا سو کچھ ہی دنوں بعد پھر شملہ کا پروگرام بنالیا لیکن اتفاق سے اسی بیچ اس کی تیسری بہن کی شادی کی خبر آ گئی اور اسے شملہ جانے کا پروگرام ملتوی کر کے وہاں جانا پڑا۔ اور رشتہ دار بہن، بھائی، بھاوج اس موقع پر جمع ہوئے تھے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ بہت دنوں بعد اسے ایسی محفل میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔

جب وہ لوگ فارغ ہو کر اکٹھے بیٹھتیں تو نہ جانے کب کب کے اور کہاں کہاں کے قصے نکل پڑتے اور مزے لے لے کر گزرے ہوئے واقعے کو دہرایا جاتا۔ وہ خاموشی سے ان لوگوں باتیں سنتی رہتی۔ ''آپ کیوں چپ ہیں باجی! آپ بھی تو کچھ بولئے۔ کیا آپ کو کچھ یاد نہیں؟''

''ہاں مجھے واقعی کچھ یاد نہیں'' بڑی مشکل سے وہ اپنے اندر کی کراہ کو دبا کر کہتی۔ حالانکہ اسے اپنے ماضی کا ایک ایک لمحہ ایک ایک بات اس طرح یاد تھی جیسے یہ کل ہی کی بات ہو لیکن وہ اپنے مندمل ہوتے ہوئے زخموں کے ٹانکے توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے تلخ ماضی کے اوراق پر لکھی ہوئی عبارت کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ماضی کا سایہ بھی اس کے حال و مستقبل پر پڑے۔ بڑی مشکل سے تو اس نے یادوں سے پیچھا چھڑایا ہے، جس کے حصار میں نہ جانے وہ کب سے تھی۔ وہ اکثر سوچتی، پہلے تو وہ ایسی نہ تھی۔ کسی ناگوار واقعہ کو زیادہ دنوں تک خود پر مسلط نہیں کرتی تھی۔ لیکن شاید اس کی زندگی میں پے در پے آنے والے حادثوں نے اسے بہت ہی زیادہ، حساس بنا دیا تھا۔ دیر تک وہ ان سوچوں میں گم رہی۔

''کچھ تو بولئے باجی کیوں خاموش ہو گئیں؟'' بہنیں اسے ٹھوکا دے

رہی تھیں پھر بھی وہ خاموش تھی، جیسے وہ بہت ہی بودی اور نااہل ہو۔

ooo

شملہ جانے کا بھوت ابھی ان لوگوں کے سر سے نہیں اترا تھا لہٰذا انہوں نے پھر پروگرام بنایا۔ اتفاق سے فرصت بھی تھی اور جیب میں پیسہ بھی۔ یہ اتفاق بڑا ہی خوشگوار تھا۔ موسم بھی سیر و تفریح کے لئے بہت ہی سازگار تھا۔ آدھا سفر ان لوگوں نے ٹرین سے طئے کیا اور آدھا کار سے۔

شملہ پہنچ کر ہوٹل کا ایک کمرہ بک کیا۔ فریش ہونے کے بعد سفر کی جو تھوڑی بہت تھکن تھی وہ دور ہوگئی اور اب بھوک کھل کر لگ رہی تھی۔ مرتضٰی ابھی فارغ نہیں ہوئے تھے لیکن اس نے ویٹر کو ناشتے کا آرڈر دے دیا تھا کیونکہ اسے چائے کی شدید طلب ہورہی تھی۔ جب بیرا چائے لے کر آیا تو کمرے کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''میڈم جی! آپ اپنے کمرے کی ساری کھڑکیاں اور دروازے بند رکھنا ورنہ یہ چھوٹے چھوٹے بندر ہیں نا وہ آپ کے سامان اٹھا کر لے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ویٹر کے مشورے کا شکریہ ادا کیا اور دل میں یہ سوچا کہ اللہ کا شکر ہے کہ یہ سامان ہی اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ورنہ وہ جس سے اکثر لوگوں کا سامنا ہوتا رہتا ہے، وہ تو ان سے زیادہ خطرناک ہیں، اچانک اسے مرتضٰی کی کہی ہوئی وہ بات یاد آگئی۔ ''دنیا میں جو یہ بے شمار بھیڑیے نما انسان ہیں وہ تو لوگوں کو پل بھر میں چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔''

شام کو جب وہ لوگ سیر کو نکلے تو دیکھا واقعی ہر جگہ بندروں کا ایک جھنڈ ہے۔ چھوٹے بڑے لا تعداد بندر تھے۔ جو عجیب و غریب حرکتیں کر رہے تھے۔ سب کے سب درختوں پر چڑھ کر کچے پکے سیب کچھ کھاتے اور کچھ کتر کتر کر نیچے گرا رہے تھے۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اچک اچک کر سیب توڑے۔ پھر اپنی بے وقوفی پر مسکرادی اور بہت پیچھے ماضی میں پہنچ گئی۔

جب ایسی ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے کے لئے اس کا دل مچلتا تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ بارش کے پانی میں اچھل اچھل کر نہائے۔ کمپاؤنڈ میں گل مہدی کی باڑھ پر بیٹھی ہوئی تتلیوں کو پکڑے۔ جگنوؤں کو ڈبہ میں بند کرے لیکن اس کے دل کی یہ خواہش دل ہی میں رہ جاتی کیونکہ اسے بار بار یہ احساس دلایا جاتا کہ ''تم اب بچی نہیں رہی۔ تتلیاں پکڑنے کے دن اب نہیں رہے اچھلنے کودنے کی عمر اب ختم ہوگئی۔''

سو اچانک وقت سے پہلے وہ بہت بڑی ہوگئی تھی اس کا بچپن بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ اپنی شوخی اپنا چنچل پن اور اسی طرح کے کئی احساسات کا گلا گھوٹتے وقت اسے جس کرب سے گزرنا پڑا تھا یہ وہی جانتی تھی۔ بہت دیر تک وہ اداس رہی۔ جب مرتضٰی نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر کہا۔ ''کہاں کھو گئیں؟'' تو بڑ بڑا کر وہ ماضی کی یادوں سے باہر آگئی اور ادھر ادھر کا نظارہ کرنے لگی۔ پھر بسکٹ کا ایک پیکٹ ایک بندر کی طرف بڑھایا، جس نے پلک جھپکے بغیر اس کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا۔ اور بتیسی نکال کر وہ چیں چیں کرتا ہوا درخت کی ایک شاخ پر چڑھ گیا۔ شاید وہ اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس جذبے میں وہ انسانوں پر سبقت لے گیا تھا۔

کچھ دور پر ایک بوڑھی عورت چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ جس

کے رخسار کی ہڈیاں ایک انچ باہر اور گال اندر کی طرف دھنسا تھا، ہاتھوں میں المونیم کا پیالہ لئے ہوئے آنے جانے والوں کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ لوگ اس کی طرف دھیان دئے بغیر لاپروائی سے گزر جاتے۔

وہ دیر سے یہ منظر دیکھ رہی تھی، اور لوگوں کی بے حسی پر افسوس کر رہی تھی۔ ''کیا دیکھ رہی ہو؟'' مرتضٰی نے ایک بار پھر اس کی محویت توڑی۔

''لوگوں کی بے حسی دیکھ رہی ہوں''، ''چھوڑو یہ اکیسویں صدی ہے۔ تمہیں جو دینا ہے دے دو اور آگے بڑھو۔'' اس نے دس کا نوٹ اس عورت کے پیالے میں ڈالا اور آگے بڑھ گئی۔

شام ڈھل رہی تھی، اندھیرا بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ مال روڈ کے ایک طرف پہاڑ پر ریسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ اسٹریٹ لائٹس بھی روشن کردی گئی تھی۔ لہٰذا پورا روڈ اور آس پاس کی دکانیں جگمگا اٹھیں۔

سجے سجائے مرد و زن سیر و تفریح اور شاپنگ میں مست تھے۔ وہ بھی ان کے پہلو بہ پہلو لطف اندوز ہو رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف بڑی بڑی دکانیں سجی تھیں۔ ان کے پیچھے یا آزو بازو چھوٹی چھوٹی دکانیں ٹھیلے پر لگی تھیں۔ ان میں قدرے کم قیمت کی چیزیں مل رہی تھیں جو خریدار کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ ویسے بڑی بڑی دکانوں پر بھی رش کم نہ تھا کیونکہ وہ اعلیٰ قسم کی رنگ برنگی اشیاء سے سجی تھیں۔ ڈکوریشن کا ایک سے ایک خوبصورت سامان لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اولن کپڑوں پر دیدہ زیب کڑھائی اسے اپنی طرف راغب کر رہی تھی۔ اس نے کئی چیزیں خریدیں اپنے رشتہ داروں کے لئے کچھ تحفے تحائف خریدے۔ دل چاہ رہا تھا اور بھی بہت ساری

چیزیں خریدے لیکن دل پر جبر کر کے وہاں سے ہٹ گلی۔ دیر رات جب سیر سے واپس آئی تو ایسی بے خبر ہوکر سوئی کہ صبح ہی نیند ٹوٹی۔ ایک ہفتہ تک ان لوگوں کا یہی مشغلہ رہا۔

ooo

وہاں آنے کے دو سال بعد خدا نے اسے ایک بچی عطا کی وہ بے حد خوش تھی۔

شاید عورت کی زندگی میں یہ سب سے خوبصورت، پر مسرت اور فخر آمیز دور ہوتا ہے جب وہ تخلیق کے کرب سے گزرتی ہے۔ اس عمل سے گزر کر ہی عورت مکمل ہوتی ہے۔ اور یہ خدا کا کرم تھا کہ وہ مکمل ہوچکی تھی۔ اس احساس نے اسے معتبر کردیا تھا کہ وہ کسی کی ماں ہے۔ اس کے قدموں کے نیچے کسی کی جنت ہے وہ بچی کو سینے سے لگا کر ہر وقت یہ دعا کرتی۔

''اے خدا تو اس بچی پر اپنی رحمت فرما، اپنی مہربانیوں سے اس کے لئے رحمت کا در کھول دینا، اسے اپنے والدین کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھانا، اسے نظر بد سے بچانا اور اس محرومی سے بھی جس سے وہ گزری ہے۔

پھر یکے بعد دیگرے دو بچے اور ہوئے۔ اب وہ پورے طور پر مکمل ہوچکی تھی۔ ساری محرومیاں دور ہوچکی تھیں۔ گزری ہوئی تکلیف دہ یادیں شاید ہی کبھی دل پر دستک دیتیں۔ یا شاید وہ ان یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اور اس لئے اپنی ساری خوشیاں اپنے بچوں میں تلاش کرتی رہتی۔ صبح سے شام تک ان کے گرد منڈلاتی رہتی ان کی دیکھ بھال اور گھر گرہستی میں وقت بہت اچھا اور بہت ہی خوشگوار گزر رہا تھا۔

سادہ لباس اور سادی رہائش میں بھی وہ خود کو بہت دولت مند سمجھتی کہ سب سے بڑی دولت اس کی اولاد تھی۔

اولاد ہی ایک ایسی شئے ہوتی ہے جس پر ماں اپنا سب کچھ نچھاور کر کے بھی دولت مند بن جاتی ہے۔ یہ نادر و نایاب تحفہ پاکر خدا کی شکر گزار ہوتی ہے۔ اس دولت کی حتی الامکان حفاظت کرتی۔ اور اونچائی تک پہنچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگادیتی ہے۔

ooo

بچے جب ذرا بڑے ہوئے اور اپنی توتلی زبان سے اسے امی کہہ کر بلانے لگے تو وہ خود کو دنیا کی کوئی اونچی مخلوق سمجھنے لگی نہ جانے یہ اس کی خوش فہمی تھی یا حقیقت۔

جب وہ ذرا اور بڑے ہوئے اور ان کی تربیت کا وقت آیا تو اب اسے باخبر رہنا تھا۔ یہ ذمہ داری بڑی سخت تھی لیکن کسی حال میں اسے اپنی یہ ذمہ داری نبھانی ہی تھی کیونکہ بچوں کی پہلی درس گاہ ماں کی آغوش ہی ہوتی ہے ویسے بھی جو تربیت ماں دے سکتی ہے وہ کوئی اور نہیں۔ وہ بچے بہت ہی بدنصیب ہوتے ہیں جن کی ماں انہیں بچپن میں ہی چھوڑ کر کسی دوسرے مرد کے ساتھ گھر بسا لیتی ہے یا ملک عدم کی طرف کوچ کر جاتی ہے، کوئی انہیں اونچ نیچ، اچھا برا، صحیح غلط بتانے والا نہیں ہوتا۔ انہیں بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ماں تو اپنے بچوں کے لئے مشعل راہ ہوتی ہے۔

یوں تو لڑکے اور لڑکی کی تربیت یکساں لازم ہے لیکن لڑکیاں کچھ زیادہ ہی توجہ طلب ہوتی ہیں کیونکہ وہ ایک ایسی نازک شئے ہوتی ہیں جنکی پاکیزگی

کے شیشے پر اگر ہلکا سا بال آجائے تو پھر!

اب بچوں کے اسکول میں داخلے کا وقت آگیا تھا لیکن وہاں مخلوط تعلیم رائج تھی۔لڑکے لڑکیاں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ اور وہ جس مشرقی معاشرے کی پروردہ تھی وہ یہ اجازت نہیں دیتا کہ مغرب کی تقلید کی جائے اپنی تہذیب وتمدن اپنے عقائد کو برقرار رکھنا تھا لیکن تغیر زمانہ نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا جب غیر تعلیم یافتہ لڑکیاں ہر جگہ کھپ جاتی تھیں۔ اب تعلیم نسواں کی ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ آئی اے، بی اے کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔لڑکیاں ڈاکٹر، انجینئر اور وکیل ہورہی تھیں مجبوراً اسے بھی بچوں کو اسی اسکول میں داخل کرنا پڑا۔لیکن ہر وقت ذہن پریشان اور دل ہولتا رہتا۔ جب کبھی اسکول سے گھر آنے میں بچوں کو دیر ہوجاتی تو وہ ورانڈے پر ٹہل ٹہل کر قرآنی آیتوں کا ورد کرتی رہتی۔ جب وہ آجاتے تو خدا کا شکر ادا کرتی اور پوچھتی۔''اتنی دیر کیوں لگادی بیٹا؟''، ''چھٹی ہوتی تب ہی تو آتی امی! آپ اتنی جلد پریشان کیوں ہوجاتی ہیں۔''

بڑی والی ذرا تیز طرار تھی۔ اس کا موڈ آف ہوجاتا''امی کو ہم پر بھروسہ ہی نہیں اور بیٹے صاحب شتر بے مہار کی طرح سارا دن گھومتے رہتے ہیں۔ اسے یہ لائسنس امی ہی نے دی ہے اور ہم تو جیسے کہیں بھاگے جارہے ہیں۔ اس روز جب میں اپنی دوست کی سالگرہ پر گئی تھی اور واپس آنے میں ذرا دیر ہوگئی تو امی اس کے دروازے تک پہنچ گئیں۔''

''ہاں میں پریشان ہوجاتی ہوں کیونکہ مجھے تم پر بھروسہ ہے مگر زمانے پر نہیں۔''

اور یہ بچوں کی فطرت کا تقاضہ تھا یا اس کی تربیت کا اثر کہ بچے بڑے

سلجھے، سلیم الطبع اور باشعور نکلے اللہ کا بڑا کرم تھا۔

ooo

جب اس کے شوہر ریٹائر ہوئے تو انہیں یہ کالونی، یہ جگہ چھوڑنی پڑی۔ اب دوسری جگہ سٹل ہونے قدم جمانے اور بچوں کو آگے تعلیم دلوانے میں آٹھ دس سال کا عرصہ گزر گیا لیکن اس درمیان اسے وہ جگہ بہت یاد آتی جہاں اس نے اپنی زندگی کا بہت ہی خوشگوار اور پرسکون دور گزارا تھا وہ اکثر خواب میں خود کو وہاں پاتی۔ حقیقتاً وہاں جانے کی تڑپ اس کے دل میں پیدا ہوتی اور تب وہ اپنے شوہر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتی۔ لیکن زندگی کے جھمیلے کب موقع دیتے ہیں، مرنے کے بعد ہی ان جھمیلوں سے فرصت ملتی ہے۔ بقول شاعر کہ:

مر گئے تیار تربت ہوگئی آج سب کاموں سے فرصت ہوگئی

لیکن اللہ کا شکر ہے، جب کچھ اطمینان ہوا تو مرتضیٰ نے اس کی خواہش پوری کردی۔ وہاں جانے کا پروگرام بن گیا۔

جب وہ روانہ ہوئی تو یادوں کا قافلہ بھی ساتھ ساتھ رواں دواں تھا۔ جیسے ہی گاڑی کالونی کے اندر داخل ہوئی، بہت سی یادیں اس کے اردگرد چکر لگانے لگیں۔ وہ سر گھما گھما کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا جاڑے کی شام اور ملگجی روشنی میں کالونی بہت ہی ویران لگ رہی تھی کوارٹر کے اندر خود رو جھاڑیاں اور درخت کی لمبی لمبی ڈالیاں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر جگہ جگہ درختوں کے خشک پتوں اور کوڑا کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ ڈرائیور کو راستہ بتاتی ہوئی سب سے پہلے اپنے کوارٹر کے پاس پہنچی پھر گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ کمپاؤنڈ اجاڑ بنا ہوا تھا کوارٹر میں نہ جانے کب سے

رنگ و روغن نہیں ہوا تھا۔ بوسیدہ دیواریں، کہیں کہیں سے اکھڑا ہوا فرش کا پلاسٹر، اور جگہ جگہ لٹکے ہوئے بجلی کے تار اپنی خستہ حالی کی داستان سنا رہے تھے۔ وہاں کی ابتر حالت دیکھ کر اس کا دل بجھ گیا اور آنکھیں چھلک آئیں۔

''کہاں گئے وہ لوگ جو کالونی کو دلہن کی طرح سجا کر رکھتے تھے؟ اب کسی کی نظریں یہاں کی خستہ حالی پر کیوں نہیں پڑتیں۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنے خیالوں کی تردید کی۔ جب کسی منہ کو حرص اور بے ایمانی کا ذائقہ مل جاتا ہے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ لالچ کی پٹی آنکھوں پر بندھ جاتی ہے۔ ان کے پیش نظر صرف اپنا مفاد ہوتا ہے۔ گاڑی، بینک بیلنس، اور اپنے بچوں کی ہائی ایجوکیشن ہوتی ہے۔ زمانے کی رفتار کتنی تیز ہوگئی ہے۔ حالات کتنی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ان دس سالوں کے اندر تغیرات رونما ہو چکے ہیں۔ وہ ابھی خیالوں میں غرق تھی کہ کسی آواز پر نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ایک شخص کھڑکی سے جھانک رہا تھا''آپ لوگوں کو کس سے ملنا ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔''کسی سے نہیں بھائی! میں اس کوارٹر میں کافی دن رہ چکا ہوں وہی ذرا دیکھنے آگیا۔'' مرتضٰی نے بہت ہی مایوسی سے کہا''تو آیئے اندر آجایئے''اس شخص نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں مجھے ذرا جلدی واپس جانا ہے۔'' کہتے ہوئے وہ لوگ منی بھابھی کے کوارٹر کی طرف چل دئے، جو چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہاں بھی اسے مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے دروازے میں تالا لٹکا تھا اور پورا کمپاؤنڈ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بازو والے گھر سے ایک عورت نکل کر آئی۔

''کسے کھوج رہے ہیں؟''اس نے پاس آکر دریافت کیا۔

''آپ کے پڑوسی کہاں ہیں؟''، ''وہ گھر گئے ہیں۔ شاید کل تک

آجائیں۔ آیئے تھوڑی دیر میرے یہاں ٹھہریے۔ چائے پانی پیجئے'' وہ عورت بہت ہی مہمان نواز تھی۔ لیکن اس کا دل برا ہوگیا، نہ جان نہ پہچان میں یہاں کیوں بیٹھوں'' اس نے بیزاری سے سوچا۔ ''نہیں مجھے جلد واپس جانا ہے۔''

''اب کیا ارادے ہیں؟'' مرتضٰی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ڈرائیور بھی حکم طلب نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ''آفیسر ہاسٹل کی طرف چلو۔''

اسے اچانک نوری بوا یاد آگئیں جو تقریباً دس بارہ سال اس کے یہاں بطور ملازمہ رہ چکی تھیں۔ اور اب آفیسر ہاسٹل کے سرونٹ کوارٹر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہ رہی تھیں۔

اس نے گاڑی ہاسٹل کے پاس رکوائی اور ایک شخص کی رہبری میں جھاڑ جنگل اور ناہموار راستوں سے گزرتی ہوئی کوارٹر تک پہنچی۔ دونوں بچیاں ساتھ تھیں۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر خمیدہ کمر والی ایک ضعیف عورت نے دروازہ کھولا اور پیشانی پر ہتھیلی کا چھجہ بنا کر چندھی چندھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کون؟ کون ہے؟''، ''میں ہوں بوا! ہما مجھے پہچانا نہیں؟

چھوٹی بیٹی ذرا ہڑبڑیا تھی، بوا کے سامنے آکر کہا۔ ''ارے ہما بٹیا!'' انہوں نے دونوں بازو پھیلا کر ہما کو لپٹالیا اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ جب آنسو تھمے تو پوچھا۔ ''کیسے آنا ہوا بابو؟''

''آپ سے ملنے آئی ہوں بوا۔'' ''اللہ میرا دل کتنا بڑا کردیا جگ جگ جیو، خوش رہو آباد رہو۔''، کیسی ہیں بوا؟''

''دیکھو بابو اب تو صحت اور گرگئی ہے۔ جب سوانگ تھا تو کبھی کبھی تم لوگوں کے پاس جاتے رہتے تھے اب تو چلنا پھرنا مشکل ہوگیا ہے۔'' ''اور بتایئے

بوا! یہاں کا حال چال؟

''کیا بتائیں بٹیا! اب نہ وہ لوگ رہے نہ وہ پیار و محبت۔ سب اپنے آپ میں مگن ہیں؛ ہم غریب کو کون پوچھے ہے۔اسی لئے تو کہیں کا آنا جانا چھوڑ دیا ہے تم لوگوں کو اتنے دن بعد دیکھ کر کتنی خوشی ہورہی ہے یہ بتا نہیں سکتے۔ بیٹھو کھانا کھا کر جانا۔''

''نہیں بوا آپ تو خود کمزور ہیں کیوں تکلیف کیجئے گا۔

''اور آپ کے بیٹے کہاں ہیں؟''،''دونوں اپنے اپنے کام پر گئے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر میں آجائیں گے۔تھوڑی دیر رک جاؤ ملاقات کرکے جانا۔''،''نہیں بوا دیر ہوجائے گی پھر کبھی مل لوں گی۔ ابھی جلد واپس جانا ہے۔''

اس نے بوا کے ہاتھ میں کچھ روپئے دیے اور جانے کی اجازت مانگی۔ بوا نے ایک بار پھر ان لوگوں کو گلے لگایا اور نم آنکھوں سے انہیں رخصت کیا وہاں سے نکلنے کے بعد اس نے پلے گراؤنڈ کے پاس گاڑی رکوائی۔ چند بچے بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ سامنے ایک بڑا سا منچ تھا جسے دیکھ کر ماضی کے بہت سارے مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ یہی وہ منچ تھا جہاں دسہرے دیوالی کے موقع پر بڑے بڑے پروگرام منعقد ہوتے تھے۔ ان یادوں کے ساتھ اسے نیلم بہن کی یاد آگئی جن سے ان لوگوں کے اچھے مراسم تھے۔ سامنے کھڑے ہوئے ایک لڑکے سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو اس سے تھوڑی سی جانکاری ملی۔ وہ لوگ اب فورم میں رہتے تھے۔

اس لڑکے کی بتائی ہوئی جگہ پر جب وہ پہنچی تو دیکھا سارے کوارٹر بند پڑے ہیں۔ دور دور تک کسی ذی روح کا پتہ نہ تھا۔ پھر اچانک نہ جانے کدھر سے ایک شخص نمودار ہوا۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔

''وہ لوگ اب یہاں نہیں رہتے، انہیں یہاں سے گئے ہوئے کافی دن ہوگئے۔

کچھ دیر وہ لوگ وہاں کھڑے رہے پھر مرتضٰی نے کہا''میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہئے، اب تو تمہارا ارمان پورا ہوگیا، ان کے لہجے میں تمسخر تھا۔ لیکن اس نے ان کی بات پر توجہ نہیں دی۔ دراصل وہ وہاں تھی ہی کہاں وہ تو ماضی کے خوشگوار ماحول میں گم، حال سے اس کا موازنہ کررہی تھی اور سوچ رہی تھی، حرام خوری اور چور بازاری کے عفریت نے چہچہاتی ہوئی جنت نشاں جیسی جگہ کو کھنڈر میں بدل دیا تھا۔ وہ اپنے دل پر ایک بھاری بوجھ لے کر وہاں سے واپس ہوئی۔

ooo

دونوں بچیوں کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد مرتضٰی نے حج بیت اللہ پر جانے کا قصد کیا۔اور اسے بھی اپنے شامل لے جانے کا پروگرام بنایاتو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کے قدم زمین پر پڑ ہی نہیں رہے تھے۔ یہ ناچیز ہستی اور اتنا بڑا اعزاز۔ وہ سجدۂ شکر بجالائی۔

جب سارے انتظام مکمل ہوگئے اور روانگی کا وقت آگیا تو قافلہ اللہم لبیک کہتا ہوا اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ جدّہ کے لئے ہماری فلائٹ کلکتہ سے تھی، کلکتہ تک ہمیں ٹرین سے جانا تھا۔ چند عزیز رشتہ دار ہمیں رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک آئے تھے۔کوئی معافی مانگ رہا تھا، کوئی سلام کا تحفہ بھیج رہا تھا کوئی رو رہا تھا، کوئی ہنس رہا تھا۔غرض ایک عجیب سا سماں تھا۔ اس کے بچوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر

دعائیں دیں۔ اس کی فلائٹ کلکتہ سے تھی۔ پوری ایک رات کا سفر طئے کر کے وہ لوگ کلکتہ پہنچے۔

وہاں سے شام سات بجے جہاز نے پرواز کیا۔ وقفے وقفے سے جب لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک کی صدائیں بلند ہوتیں تو دل پر ایک بے خودی سی چھاجاتی جیسے کوئی اسے پکار رہا ہو۔ یہ اس کی پکار ہی تو تھی جو ہم ساری بندشیں توڑ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ جوں جوں ہم اس پاک سرزمین سے قریب ہوتے جارہے تھے، دل کے جوش خروش میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ پورے سفر میں یہی حال رہا۔ آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس متبرک جگہ کو دیکھنے کی آرزو اور خوشی سے دل معمور تھا۔ جب جدّہ ایئر پورٹ پر جہاز لینڈ کرنے لگا اور نظر نیچے کی طرف گئی تو ایسا لگا کہ روشنیوں کا شہر آباد ہے۔ تا حدِ نظر برقی روشنیوں کا سلسلہ عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔

ائیر پورٹ پر اترنے کے بعد چند مراحل سے گزرنا پڑا کئی دشواریاں پیش آئیں۔ کسٹم والوں نے چیکنگ کے دوران سامان بالکل ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اسے پھر سے سمیٹنے میں تھوڑی دشواری ہوئی۔ لیکن جو جذبہ دل میں موجزن تھا اس کے مقابلے میں یہ دشواریاں کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھیں۔ ان سب کاموں سے فرصت پانے کے بعد سب لوگ ایک وسیع اور عریض پنڈال میں داخل ہوئے۔

اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ سب نے نفل نماز ادا کی۔ صبح صادق سے قابل ان لوگوں کی بس مکہ معظّمہ کے لئے روانہ ہوئی۔ اسے کھڑکی کے پاس سیٹ ملی تھی۔ وہ پر شوق نظروں سے کھڑکی کے باہر اس پاک سرزمین کو مسلسل دیکھتی رہی جس راہ سے شاید کبھی ہمارے نبیؐ کا گزر ہوا ہو۔ وہ کھوسی

گئی۔ اس کے تخیل کی رو صدیوں پیچھے چکر کاٹ رہی تھی۔ بس کے اندر تلاوتِ کلمات خود بخود لب پر آتے جا رہے تھے۔

تقریباً دس بجے دن میں بس مکہ معظّمہ پہنچی۔ ایک ہوٹل میں ان لوگوں کا قیام ہوا۔ جو حرم شریف سے قریب تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد یہ قافلہ ایک معلم کی رہبری میں پہلی زیارت کے لئے روانہ ہوا۔

اس کی بیتابی عروج پر تھی۔ منٹوں کا فاصلہ صدیوں پر محیط تھا۔ جب وہ حرم شریف میں داخل ہوئی تو پاؤں میں لرزش تھی۔ دل دھڑک رہا تھا، اس در کا کرنے کی تاب نہ تھی کہ یہ سراپا تو مجسم گناہ میں، ڈوبا تھا۔ وہ ایک لمحۂ ندامت تھا جس نے آبشار کے دہانے کھول دیئے تھے اور زبان ساکت تھی۔ کچھ یاد نہ رہا ساری دعائیں جو مانگنی تھی سب بھول گئی۔ پھر جو ذرا ہوش آیا تو جسم کا ایک ایک رواں زبان بن کر حالِ دل سنا رہا تھا۔ اشک ندامت نے اندر کی آلودگی کو قدرے کم کر دیا تھا۔ دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا تو طواف میں لگ گئی۔ طواف اور سعی کے دوران جب وہ دیکھتی کہ ہر ملک کے باشندے موجود ہیں۔ نہ رنگ و نسل کی قید ہے نہ امارت و غربت کی۔ سب ایک ہی کلمہ کے شریک ہیں۔ ایک ہی جذبہ سے سرشار ہیں تو دل ایک عجیب سی کیفیت اور خوشی سے لبریز ہو جاتا۔

خانہ کعبہ کو چومنے اور آنکھوں سے لگانے کی آرزو تھی لیکن ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ ایک قدم بھی بڑھانا دشوار تھا مگر جذبۂ شوق اسے کھینچ رہا تھا۔ اور یہ کوئی روحانی طاقت ہی تھی جو اسے کھینچ رہی تھی۔

یوں تو وہاں پر سب ہی رو رہے تھے لیکن ایک نوجوان جو شاید ایک نو مسلم نوجوان تھا۔ وہ خانہ کعبہ کی دیوار سے چمٹا ہوا اس قدر زار و قطار رو رہا تھا کہ بسیار گریہ زاری سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنسو کی جھڑی تھمنے کا نام نہ

لے رہی تھی۔ معلم اسے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ نہ کچھ دیکھ رہا تھا نہ سن رہا تھا۔ اس کی کیفیت بالکل مجذوب جیسی تھی۔ یہ عشق کی انتہا تھی جس نے اسے عقل وخرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔

اے خدا تیرے کیسے کیسے شیدائی ہیں۔ اسے اپنی ذات بہت ہی حقیر لگنے لگی۔

خانہ کعبہ کا غلاف اس کے ہاتھ میں تھا اور پیشانی اس کی دیوار پر۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

نہ جانے یہ آنسو اپنے گناہوں پر ندامت کے تھے یا شکر گزاری کے۔ اس کے خزانے میں وہ الفاظ نہیں تھے جو اس قادر مطلق کا شکر ادا کرتی، جو ذرّوں کو آفتاب بنانے پر قادر ہے۔ اس ناچیز کو یہ مرتبہ بخشا۔ اپنے محبوب نبیؐ کی امت میں شامل کیا، اس مقام پر اس جگہ پہنچایا۔ جس کی برابری کا دعویٰ کائنات کا کوئی خطہ بھی نہیں کرسکتا۔ احترام، عقیدت اور تعظیم سے اس کا سر جھکا جارہا تھا۔

ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں ایک مبہم سا خیال آیا۔ کاش وہ بھی اس فریضہ کو اس طرح ادا کرتی جب اس میں صعوبتیں تھیں، ریاضتیں تھیں، مشقتیں تھیں۔ ان مشقتوں کی سیڑھیاں طئے کر کے وہ بھی اپنے رب کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرسکتی۔ لیکن اب حالات بدل گئے، زمانہ بدل گیا، زمانے کے تقاضے بدل گئے۔ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول کرلی اور مکہ مدینہ والوں پر اپنی رحمتوں اپنی عنایتوں کی بارش کردی۔ اللہ اللہ ہر طرف ایسی پاکیزگی، ایسی تجلی، ایسا نور جیسے خدا خود جلوہ افروز ہو۔

وہ تصویر حیرت بنی ایک ایک چیز میں اس کا ظہور تلاش کر رہی تھی۔

اشیاء کی فراوانی، جگہ کی کشادگی، آب زم زم کی بہتات، کشادہ چمکیلی سڑکیں، بڑے بڑے خوبصورت شیشے کی طرح چمکیلے اور خوشبوؤں سے معطر شاپ، ہوٹلیں، فارمیسی، منی چینجرز، ٹیلی فون بوتھ، حاجیوں کے آرام اور سہولتوں کا ایسا انتظام کہ عقل دنگ تھی۔ اللہ نے اس شہر کے دامن کو اتنا وسیع کیا کہ ایک عظیم مجمع اس میں یوں سمایا کہ پتہ بھی نہ چلا۔ نہ کوئی ہنگامہ، نہ بے ترتیبی، نہ آلودگی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ کولتار کی سڑکیں اور اونچی اونچی پختہ عمارتوں نے حضورؐ کے نقش پا کو مٹا دیا تھا لیکن وہ خوشبو جو فضا میں رچی بسی تھی اسے کون مٹا سکتا ہے۔ یہ تو ہمہ وقت روح و جاں کو معطر کرتی رہتی ہے۔ ہمارے سروں پر سایہ فگن اور قدم قدم پر رہنمائی کرتی ہے۔

چودہ سو سال قبل جو اس جگہ پیغامبر بن کر آیا تھا وہ آج بھی ہمیں راہ مستقیم پر چلنے کا پیغام دے رہا ہے۔ حج کا وقت آ گیا تھا۔ دو دن منیٰ میں رہنے کے بعد پھر سب لوگ عرفات پہنچے وہاں حشر کے میدان جیسا سماں تھا۔ ہر شخص اپنے گریباں میں جھانک رہا تھا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد مزدلفہ پہنچے۔ وہاں پوری زمیں آرام گاہ تھی اور پورا آسمان جنت تھا۔ نہ کوئی شاہ تھا نہ گدا۔ سب ایک ہی رب کے بندے تھے۔ شاید اسی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اقبال نے کہا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اس رات اس نے کچھ جاگتے کچھ سوتے اور کچھ ذکر الٰہی میں گزار دی۔ اس مہربان ذات سے اسے امید تھی کہ اس کی اس تھوڑی سی عبادت کو شرف قبولیت بخش کر اس کی بخشائش کی راہ ہموار کر دے۔ آمین

حج کے سارے فرائض ادا ہو جانے کے بعد وہ اپنے پیارے نبیؐ کے

روضۂ اقدس کے دیدار کا جذبۂ شوق لے کر مدینہ پاک پہنچی تب اسے ایسا لگا کہ وہ ماں کی آغوش میں پہنچ گئی۔

مسجد نبوی میں چالیس وقت کی نماز ادا کی بعد ازاں چند تاریخی اور متبرک مقام کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہوا۔ ایک معلم ساتھ تھا وہ ہر مقام کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔

یہ مسجد قبا ہے، جب سرور کائنات مکہ معظّمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے تو اس جگہ رک کر اس مسجد کی بناد ڈالی تھی۔

یہ وہ پہاڑ ہے جہاں احد کی لڑائی ہوئی تھی اور حضورؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے تھے۔ ''یہ وہ میدان ہے جہاں صحابہ کرام کے مزارات ہیں جو جنگ احد میں شہید ہوئے تھے۔

''یہ مسجد قبلتین ہے جب حضورؐ اقدس ظہر کی نماز ادا کر رہے تھے، اسی وقت وحی نازل ہوئی اور قبلہ کی بشارت دی گئی۔ وحی نازل ہوتے ہی حضورؐ نے بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف رخ کر لیا۔

''یہ وہ جگہ ہے جہاں پر حضورؐ نے آخری خطبہ دیا تھا۔ معلم بتا رہا تھا اور اس کا ذہن صدیوں پیچھے بے آب و گیاہ، صحرا، پہاڑ، کھوہ اور غار کے مناظر میں کھویا ہوا تھا کہ کیسی کیسی تکلیفیں ان لوگوں نے دین کو پھیلانے میں اٹھائی تھیں۔ کبھی غار میں چھپے، کبھی کئی کئی روز بھوکے پیاسے رہنا پڑا، کبھی لڑائی کے میدان میں اپنا عضو کھونا پڑا۔ یہ طلسم تو اس وقت ٹوٹا جب بس ایک پُر رونق سڑک پر آ کر رک گئی۔ سارے لوگ اتر گئے اور وہ اسی صحرا کے طلسم میں کھوئی ہوئی تھی۔

وطن جانے سے پہلے ایک بار پھر خدا کے دربار میں حاضری دینی تھی۔

اس بار وہاں صرف ایک ہفتہ قیام رہا۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت خانۂ کعبہ پر جب الوداعی نظر ڈالی تو دل کی عجیب کیفیت تھی۔ آنکھیں اشکبار تھیں۔ اور لب پر یہ دعا تھی کہ اے خدا ایک بار پھر اس در پر آنے کی سعادت بخشنا۔ آمین۔

ooo

اور پھر خدا نے اس کی بہت جلد سن لی۔ اس کی یہ دعا قبول ہوگئی۔ صرف دو سال بعد ہی وہ اس پاک سرزمین پر آ پہنچی۔

اس دفعہ عمرہ کے لئے آئی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا اللہ اللہ خدا نے یہ رتبہ اسے بخشا تھا۔ عبادت کا بہترین موقع تھا۔ وہ زیادہ وقت حرم شریف میں ہی گزارتی پندرہ دنوں میں اس نے کئی عمرہ کر لئے۔ پھر مدینہ پاک اپنے پیارے نبی کے روضۂ اقدس پر حاضری دینے کے لئے روانہ ہوگئی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس سعادت سے محروم رہ جاتی۔

جب وہ لوگ مسجد نبوی کے گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو بہت سارے لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور ہر کوئی انہیں اپنے ساتھ افطار کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہ یہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی کے قصے پہلے بھی کتابوں میں پڑھ چکی تھی۔

جب نبیؐ مکہ معظّمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہر کوئی انہیں اپنا مہمان بنانے کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن کسی کا دل توڑنا، انہیں رنج پہنچانا ان کا شیوہ نہ تھا چنانچہ انہوں نے فرمایا۔

''میری اوٹنی جس کے دروازے پر بیٹھ جائے گی، میں اس کا مہماں بنوں گا۔ اور یہ شرف حضرت ایوب انصاریؓ کو حاصل ہوا۔

وہ حج کے موقع پر بھی یہاں آئی تھی لیکن اس دفعہ رونق ہی کچھ اور تھی۔ ہر طرف نور ہی نور برس رہا تھا۔ وہاں کے باشندوں کی طرف سے ضیافت کا اعلیٰ انتظام تھا۔ انواع واقسام کی چیزیں دسترخوان پر چنی ہوتیں۔ ایک ہفتہ ان لوگوں کا قیام وہاں رہا پھر مکہ معظمہ لوٹ گئی۔ عید کی نماز وہیں ادا کی اور پھر وطن واپس آ گئی۔

OOO

جب وہ فریضۂ حج ادا کر کے واپس آئی تو بہت ہی مطمئن اور پرسکون تھی۔ اب اسکے دل میں کوئی تمنا باقی نہ رہی تھی۔ ساری محرومیاں دور ہو چکی تھیں۔ وہ محرومیاں جو اس نے برسوں جھیلی تھیں۔ اپنی عزت نفس، اپنی خودداری اپنی انا کا گلا گھوٹنا تھا۔ اور برباد ذلیل وخوار ہوئی تھی۔ تب اس نے جانا تھا کہ عورت کے لئے ایک مضبوط سہارا کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک گھر، ایک آنگن کی آرزو میں وہ کیسے کیسے مراحل سے گزری تھی۔ کیسے کیسے لفظوں کے تیر اپنے سینے پر سہے تھے۔ تضحیک آمیز قہقہوں کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

لیکن ہر خزاں کے بعد بہار آتی ہے اور اندھیری رات کے بعد روشن صبح ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کے آنگن میں بھی روشن اور چمکیلی صبح طلوع ہو چکی تھی جس نے بیتے دنوں کے سارے اندھیرے دور کر دئے تھے۔

اب جب کبھی وہ اپنی ڈائری کے اوراق پلٹ کر دیکھتی ہے تو ہر ورق اس کی محرومی کی داستان سناتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً حادثاتی طور پر اس کی زندگی میں رونما ہوتے رہے تھے اور وہ دکھی اور مایوس ہوتی رہی تھی۔

اب وہ سوچتی ہے کہ کتنی نادان تھی وہ کہ جو کچھ اللہ نے اسے عطا کیا تھا اس عنایت پر تو کبھی اس نے اس مہربان کا شکریہ ادا نہ کیا اور جو کمی اس کی زندگی میں تھی، اس کو یاد کرکے وہ اپنے رب سے ہمیشہ شکوہ کناں رہی۔ یہ نہ سوچا کہ وہ ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے وہ بھلا انہیں کیسے نظر انداز کرسکتا ہے۔

یہ تو ایک آزمائش تھی۔ وہ جتنا قہار اور جبار ہے اس سے کئی گنا زیادہ رحیم اور کریم ہے۔ وہ اپنے بندوں سے کبھی بے خبر نہیں ہوتا۔ آگے یا پیچھے نوازتا ضرور ہے۔

اسے بھی ایک آسودہ اور خوشگوار زندگی کی ضمانت دی۔ یہ اسی کا کرم ہے کہ محرومی کی دلدل سے اسے نکالا۔

انسان کی زندگی میں تین ادوار آتے ہیں۔، بچپن، جوانی اور بڑھاپا اور جس کا آخری دور سنور گیا وہی انسان کامیاب ہے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس زبان سے اپنے خالق، اپنے مالک اور حاکم کا شکریہ ادا کرے۔ جس نے اسے یہ رتبہ بخشا، معاشرے میں ایک مقام دیا، سائبان دیا، محبت کرنے والا شوہر دیا، لائق اور خدمت گزار اولاد دی۔ اب اسے اور کیا چاہئے۔

اس کی دنیا مکمل ہوچکی تھی۔

خزاں کا دور گزر چکا تھا۔ رنگ و بو سے لبریز، موسم بہار کے خوشگوار سائے میں زندگی کا آسودۂ حال سفر جاری تھا۔

❁❁❁

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

مشاہیر کے تاثرات

مشاہیر کے تاثرات

نقارخانہ کے حوالے ہے:

☆ ''نوشابہ خاتون کی آواز غالباً ان کے خیال میں طوطی کی آواز کے مصداق ہے اور وہ معاشرہ، وہ سماج یا وہ دنیا جس میں وہ جیتی ہیں، ایک نقارخانہ ہے جس میں طوطی کی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ یہ آواز دل کی زبان سے ابھرتی ہو یا آنکھ کی نوکِ پلک سے یا فکر کے گنبد بے در سے، کسی بھی سمت سے یا کسی بھی رفتار سے، روایتی اقداری نظام کا زائیدہ اور پروردہ اس صورت حال میں جس ردعمل پر مجبور ہوگا، وہ غیر فطری نہیں اور یہی فطری تجربہ ہے جو نوشابہ خاتون کے افسانوں میں ڈھل کر فنی تجربہ بن گیا ہے جس میں ہر خاص و عام کو متاثر کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔'' (ڈاکٹر منظر اعجاز)

☆ ''نوشابہ خاتون ہمعصر افتاں و خیزاں زندگی جینے والے افراد کی داخلی اور خارجی کیفیات سے بھی اچھی طرح واقف نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار بالکل مانوس اور جانے پہچانے سے لگتے ہیں اور قارئین کی توجہ اور دلچسپی کا باعث بھی بنتے ہیں۔'' (قیصر اقبال)

☆ ''نوشابہ خاتون اردو کے افسانوی ادب میں غیر معروف نہیں ہیں۔..... ان کے افسانوں میں سادگی اور پرکاری کی جو ملی جلی کیفیت ہے وہ انہیں دوسرے ہمعصر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ زندگی سے جڑی ہوئی سچائیوں کو موصوفہ نے جس چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ لائق تحسین ہے۔'' (اقبال حسن آزاد)

☆ ویسے تو نوشابہ خاتون کا ہر افسانہ کسی نہ کسی زاویے سے متاثر کرتا ہے لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے ماجرانگاری کے اعتبار سے اور طرز و اسلوب کے انداز سے وہ قاری کے دل و دماغ میں بہت جلد اپنی جگہ بنالیتی ہیں۔ وہ افکار و تصورات کو ہر چند کہ کسی فلسفی اور مفکر کی طرح نہیں برتتیں لیکن پلاٹ سازی یا ماجراطرازی میں چھوٹے چھوٹے واقعات، معمولی واردات کی پیوندکاری اس خوبصورتی کے ساتھ کرتی ہیں کہ معنوی ارتباط اور ہم آہنگی سے فن کا سلیقہ ظاہر ہونے لگتا ہے۔ فکری منہاج اور نقطۂ نظر قاری کے ذہن پر عکس ریز ہونے لگتے ہیں۔ پکھیرو، آخری کہانی، علی میاں کی بلی، منو، احساس کا کرب اور وطن میں اجنبی جیسے افسانے معمولی اور عمومی موضوعات پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی غیر معمولی اثرات مرتب کرتے ہیں۔'' (طیب رضا: ماخوذ ''نوشابہ خاتون اور نقارخانہ'' کے افسانے)

بالادست کے حوالے سے:

☆ ''زبان و بیان پر گرفت، افسانوں کی بنت چند دنوں میں نہیں آتیں، اس کے لئے برسوں کے ریاض کی ضرورت ہوتی ہے اور بسا اوقات اس کے بعد بھی گرفت میں نہیں آتیں۔ نوشابہ خاتون اس معاملے میں خوش قسمت ہیں کہ انھیں فن کا شعور ودیعت ہوا ہے۔'' (عبدالصمد)

☆ نوشابہ خاتون کے افسانوں کا مجموعہ ''بالادست'' اپنے موضوعات کے لحاظ سے میرے لیے خاص دلچسپی کا موجب بنا ہے۔ کچی عمروں کے نیک پاک احساسات سے لے کر رومانوی جذبات تک پھیلی ہوئی جو کہانیاں ہیں ان میں ایک خاص نوع کی اور خواتین سے مخصوص رومانی کیفیت تو ملنا ہی تھی، تاہم نوشابہ خاتون نے ان موضوعات سے آگے بڑھ کر کئی اہم سماجی

اور نفسیاتی عوامل کے تجزیے پر مشتمل ہے جو اپنے منگیتر عمران کے سلوک سے کانچ کی طرح ٹوٹتی اور کرچیوں کی طرح بکھرتی ہے لیکن روایتی تہذیب کی زائیدہ و پروردہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے دستور کے مطابق پڑھی لکھی اور معاشرتی اقدار کی پابند بھی ہے، اس لئے اپنے وجود کے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹتی بھی ہے اور از سرِ نو تشکیل بھی دیتی ہے۔ زندگی کے زہر کو نوشِ جان بھی کرتی ہے اور اسے نوشتۂ حیات بنا ڈالنے کی حوصلہ مندانہ کوشش بھی کرتی ہے۔ اس قصے میں زندگی کی ناکامیوں سے کام لینے کی اس کی کاوش اسے ایک مثالی نسوانی کردار کے طور پر ابھارتی ہے۔'' (ڈاکٹر منظر اعجاز)

❁❁❁

یادداشت

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

نوشابہ خاتون کے افسانوں اور ناولوں کے مطالعہ سے جو ایک پہلو نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے وہ ہے ان کا اصلاحی نظریہ۔ معاشرے کی ناہمواریاں اور نسوانی مسائل ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان پر وہ خوب خوب خامہ فرسائی کرتی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ نسوانی مسائل کی پیش کش میں توازن برقرار رکھتی ہیں یعنی مردوں کے مسئلوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتی ہیں۔ ایک ناول ''نیا شوفر'' اور دو افسانوی مجموعے ''نقار خانہ'' اور ''بالا دست'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ خزاں کے بعد ان کا یہ دوسرا ناول ہے جو سوانحی نوعیت کا ہے۔

(سید تنویر حسین)

KHIZAN KE BAAD

(Novel)

By: *Naushaba Khatoon*

آج کی خواتین افسانہ نگاروں کے منظر نامے میں نوشابہ خاتون کا شناس نامہ بھی مرتب ہو چکا ہے۔ لیکن انہوں نے اس دائرے سے آگے بھی قدم
ا ہے۔ انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں اور افسانوں کی طرح ناولوں میں بھی سماجی مسائل کی عکاسیاں کی ہیں۔ ایک ناول ''نیا شوفر'' کچھ عرصہ پہلے شائع ہو
ہے۔

خزاں کے بعد ان کا دوسرا ناول ہے لیکن یہ سوانحی قسم کا ناول ہے۔ اس میں بھی سماجی مسائل کی ہی عکاسیاں نظر آتی ہیں لیکن سماج کے خلاف باغیانہ
نہیں ابھرتا، ان کا احتجاجی شعور نہیں چنگھاڑتا، وہ رجحان نہیں نظر آتا جو فیمنزم سے متاثر خواتین اہل قلم کا خاصہ ہے۔ اگر شکوہ سنجی ہے تو وہ بھی ایسی جیسے حرف
ظ زباں کے تلے دب کر ٹوٹ گئے ہوں۔

''خزاں کے بعد'' میں نوشین کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ نوشابہ خاتون نے اسی کی زندگی کے نشیب و فراز کو اس ناول کے صفحات
رات میں منعکس کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش تہذیب و معاشرت کے زیر اثر دکھائی دیتی ہے۔

نوشابہ خاتون کا اختصاص و امتیاز پہلی نظر میں زبان و بیان کے اسلوب سے متعین ہوتا ہے جس میں درد و داغ اور سوز و گداز کے سا
ں کے آیات و آثار بھی روشن ہیں۔

ڈاکٹر منظر اعجاز

پروفیسر و صدر پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو،

rary